ادبی چوپال

(ادبی کالم)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

❖

فقط یہی تو ہے مدفن شکستہ یادوں کا
مری متاعِ گراں ہے یہ حافظہ میرا

❖

ادبی چوپال

(کالم)
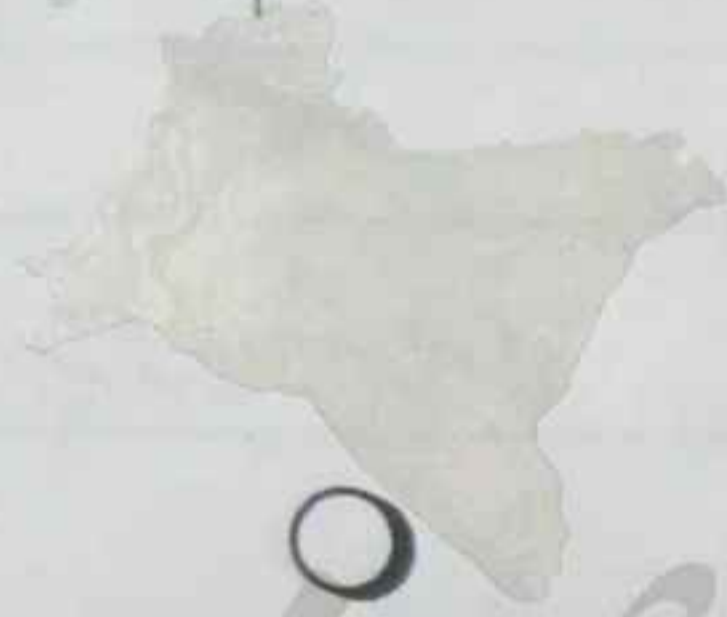
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اظہار سنز

۱۹۔ اُردو بازار، لاہور (پاکستان)

جون ۲۰۰۹ء

ادبی چوپال

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ناشر

سیّد محمد علی انجم رضوی

طابع

سیّد اظہار الحسن رضوی

مطبع

اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور

کمپوزنگ

تصور کمپوزنگ سنٹر، سید پلازہ، فیروز پور روڈ لاہور

قیمت ۲۲۵ روپے

یکے از مطبوعات

اظہار سنز ۱۹۔اُردو بازار، لاہور (پاکستان) فون: ۷۲۳۰۱۵۰

انتساب

اپنے محسن، مہربان اور کرم فرما

محترم ڈاکٹر سلیم اختر صاحب

کے نام

❖

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی دیگر کتب

- مفاہیم (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
- ترجیحات (تحقیقی وتنقیدی مقالات) (انعام یافتہ)
- اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
- تصریحات (تحقیقی وتنقیدی مقالات) (انعام یافتہ)
- ترغیبات (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
- جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق وتنقید)
- مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی (تحقیق وتنقید)
- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (تحقیق وتنقید)
- طاہرین (سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، مناقب اور سلام۔ تجزیہ وتدوین)
- العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ و تدوین)
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق وتنقید)
- باقیاتِ آلِ رضا (سیّد آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
- آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)
- کلیاتِ حبیب (حبیب جونپوری کے کلام کی تدوین)
- شام وسحر کی باتیں (ماہنامہ "شام وسحر" لاہور کے اداریے)
- قیصرِ اقلیمِ مرثیہ (تحقیق وتنقید)
- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت وفن)
- سیف زلفی کے مرثیے (تجزیہ وتدوین)
- قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کی تدوین)
- حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تحقیق وتنقید)
- ادبی بیٹھک (ادبی کالم)

مندرجات

❖ میری کالم نگاری — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن — ۱۱

نایاب

❖

◆ ایک خود فراموش شاعر۔ مجاز لکھنوی — ۱۵
◆ وقت کی آواز۔ ناصر کاظمی — ۲۸
◆ ایک کھلنڈرا شاعر۔ جون ایلیا — ۴۱
◆ محبت اور انقلاب کا شاعر۔ احمد فراز — ۵۴
◆ ایک ہمہ جہت تخلیق کار۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان — ۵۹
◆ آبروئے صحافت۔ حمید کوثری — ۶۶

کم یاب

❖

◆ ایک عہد آفرین شاعر۔ شہزاد احمد — ۷۳
◆ اردو ادب کا فرہاد۔ ڈاکٹر انور سدید — ۸۱
◆ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا زریں انتخاب — ۸۶
◆ جدید تہذیبی اقدار کا امین۔ ڈاکٹر سعادت سعید — ۹۴
◆ پتھر کی میلی آنکھ اور رب نواز مائل — ۱۰۳
◆ اُجالوں کا سفیر۔ خورشید بیگ میلسوی — ۱۱۱
◆ عزم وہمت کا شاعر۔ اختر سعیدی — ۱۱۷
◆ مثبت قدروں کی حامل تخلیق کار۔ نجمہ سہیل — ۱۲۲
◆ ذات سے کائنات تک کا مسافر۔ جمیل صادق — ۱۲۸

- صحرائے قطر کا آہو۔ ممتاز راشد ۱۳۴
- ڈاکٹر کنول فیروز۔ محبت اور سچائی کا علمبردار ۱۳۹
- 'سکوت' کا شور اور نزہت عباسی ۱۴۴

❖ احباب

- روشنی سے راستہ کشید کرنے والا شاعر۔ زاہد شمسی ۱۵۳
- ایک معتبر تخلیق کار۔ پروفیسر ظفر چشتی ۱۵۸
- تنویر حسین کی تخلیقات میں طربیہ عناصر ۱۶۳
- نذیر اے۔ قمر کا 'چاند اکیلا ہے' ۱۶۸
- ایک ہوش مند تخلیق کار۔ پریا تابیتا ۱۷۲
- شفیق الرحمن الہ آبادی کا 'آئینہ خیال' ۱۷۷
- اسد اعوان کا شعری کارنامہ 'نہ اس طرح سے ملو' ۱۸۴
- فدائے اردو۔ سید روح الامین ۱۸۹
- اعظم کمال کی رجوعی غزلیں ۱۹۵
- لفظوں سے تصویر بنانے والی شبہ طراز ۲۰۲
- 'تیرے دیے ہوئے عذاب' اور شاہد چودھری ۲۰۸
- وحید عزیز کا شعری کارنامہ 'کوئی فاصلہ نہ ہو' ۲۱۴
- اُجلے من کا نقاد۔ قدرت اللہ شہزاد ۲۲۴
- ایک مہذب شاعرہ۔ الویرا یاسمین علی ۲۳۰
- حرکت و عمل کا استعارہ۔ محمد آصف وٹو ۲۳۶

❖❖❖

میری کالم نگاری

اردو زبان کے فروغ میں صحافت کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ ہمارے بعض ''صحافی نما ادیبوں'' کی تخلیقات آج بھی قارئین کے دلوں پر دستک دے رہی ہیں۔ ان صحافیوں کی خدمات کا احاطہ کرنا مجھ ہیچمداں کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسی طرح ہمارے ''ادیب نما صحافیوں'' نے بھی اپنے خونِ جگر سے علم وادب کی جو شمع روشن کی ہے اس کی پاکیزہ اور تر وتازہ روشنی سے شعر وادب کے ایوان آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ ان دونوں اقسام کے تخلیق کاروں کے باعث ادب وصحافت کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوگیا ہے تاہم تمام تر تعلقات ومراسم کے باوجود ادب، ادب ہے اور صحافت، صحافت۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ

آب حیواں سے اس کو کیا نسبت
پانی پانی ہے اور شراب شراب

میں نے صحافت اور ادب کے درمیان ایک تیسری راہ یہ نکالی کہ ادب اور ادیبوں کے مسائل کا سماجی سطح پر مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر وضع کیا۔ اس کے بعد میں نے روایت، وراثت اور انفرادیت کی تکون کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں مضامین لکھے اور انہیں کالم کا روپ دے کر اخبارات کے صفحات کی زینت بنا دیا۔ آپ ادبی بیٹھک، ادبی

چوپال، مشاہیر، جہانِ ادب اور ادبی دستک میں موجود کالموں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرما لیجیے، آپ کو محسوس ہوگا کہ میں نے ادب اور ادیب کی عزت و حرمت میں اضافے کی مشکور سعی کی ہے۔

عصرِ حاضر میں میڈیا کی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے پوری دنیا کو اپنے سحر میں گرفتار کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود پرنٹ میڈیا کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ میڈیا نے ادب اور ادیب کو کم حیثیت اور بے وقعت سمجھتے ہوئے اسے اپنے حلقۂ اثر سے خارج کر دیا ہے۔ آپ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کا عمیق نگاہی سے جائزہ لے لیجیے آپ دیکھیں گے کہ ان کی ادب و ادیب کے لیے دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے......؟؟ ادیبوں کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کو علومِ متداولہ سے ہم آہنگ نہیں کیا اور ان کا رشتہ سماجیات و معاشیات سے جوڑنے کی شعوری کاوش نہیں کی۔ ہماری شاعری گل و بلبل کی دلفریب حکایات کے اردگرد گھومتی رہی اور نثر فرضی قصے کہانیوں کی نذر ہو گئی۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادب اور ادیب کو معاشرے کے لیے غیر مفید بلکہ نقصان دہ قرار دے دیا گیا۔ اس کبیدہ صورتِ حال میں راقم الحروف نے ادب اور ادیب کی حرمت بحال کرنے کے لیے تمام اہم اخبارات اور جرائد میں ادیبوں کی شخصیت و فن اور ادبی مسائل و معاملات پر مضامین نما کالم لکھے۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ پوری دنیا میں اردو کے قارئین نے اس سلسلے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور میری حوصلہ افزائی کے لیے ان کی مدح سرائی کی۔ قارئین کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے باعث یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

عصرِ حاضر میں ادب پڑھنے والے کم یاب اور ادب لکھنے والے نایاب ہو گئے ہیں۔ اس صورت حال میں ادبی مسائل کو موضوع بنانا کسی بھی کالم نگار کے لیے صرف ''جی کا زیاں'' ہے اور میں نے عمر بھر یہی کام کیا ہے اور شاید میں اس کے علاوہ کچھ کرنے کا اہل بھی

نہیں ہوں۔ کیونکہ :

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

یہ چھوٹے چھوٹے کالم ادیبوں اور شاعروں کے لیے میری جانب سے محض ''تحفۂ اخلاص'' ہیں۔ میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر اپنا کام کیے جا رہا ہوں تاہم ان کالموں کی اجرت صرف اور صرف ''دعا'' ہے۔ آپ دعا فرمائیے کہ میں اسی طرح شعر و ادب کی مقدور بھر خدمت کرتا رہوں۔

میری کالم نگاری کا آغاز روزنامہ 'دن' لاہور سے ہوا۔ جناب حافظ شفیق الرحمٰن، جناب اشرف شریف، جناب سلیم چودھری، جناب شاہنواز رانا اور اے ڈی صاحب نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ 'مساوات' میں جناب سجاد بخاری اور جناب اسد بھٹی نے ہمیشہ میری عزت افزائی کی۔ روزنامہ 'الجریدہ' لاہور میں جناب قیوم شاہ نے مجھے عزم و حوصلہ عطا کیا۔ روزنامہ 'آج کل' لاہور میں جناب ندیم رضا، جناب تنویر عباس، محترمہ نوشین نقوی اور جناب غضنفر کاظمی نے میرے وقار میں اضافہ کیا۔ روزنامہ 'سما' لاہور کے جناب رؤف احمد روفی نے میرے کالموں کو مسلسل شائع کر کے میری نیک نامی میں اضافہ کیا۔ روزنامہ 'اساس' لاہور کے جناب صلاح الدین اولکھ اور عمران صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے نئے نئے ادبی مسائل لکھنے پر آمادہ کیا۔ روزنامہ 'جناح' میں جناب نعیم مصطفٰے نے میرے مضامین اور کالموں کو اہتمام سے شائع کرا کے مجھے ممنون ہونے کا موقع عطا فرمایا۔ میں ان تمام احباب کا بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے میرے کالم پڑھنے کے بعد میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

آخر میں مجھے اپنے والدین (جناب سید وحید الحسن ہاشمی اور محترمہ سرفراز فاطمہ) اور بھائیوں (سید وصی الحسن نقاش، سید شریف الحسن اور عرفی ہاشمی) اور خصوصاً سید ناصر علی

(بہنوئی) کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان کی دعاؤں اور فراہم کردہ آسانیوں کے باعث میں تخلیقی کاموں میں مستعد رہتا ہوں۔ میری زوجہ (سیماب رضوی) اور بچوں (ایما حسن، اشا حسن اور وجیہ الحسن) نے میری تخلیقی سرگرمیوں کی جتنی حوصلہ افزائی کی ہے اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ جناب ڈاکٹر عبدالکریم خالد، جناب پروفیسر جعفر علی، جناب پروفیسر جرأت عباس، جناب پروفیسر آصف وٹو، جناب ارسلان ریاض شیخ، جناب انجم رضوی اور جناب تصور حسین میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ میری دعا ہے کہ مجھے سہولتیں عطا کرنے والے دنیا میں سرخرو رہیں۔ میں یہ کتاب اپنے محسن، مہربان اور کرم فرما معروف نقاد، مستند محقق اور مقبول دانشور جنابِ **ڈاکٹر سلیم اختر** کی نذر کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں طویل عمر عطا فرمائے۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

(ڈاکٹر) سید شبیہ الحسن
یکم جون ۲۰۰۹ء

رابطہ ۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ لاہور
موبائل ۰۳۳۳۔۴۲۵۵۱۵۴

❖❖❖

- ایک خود فراموش شاعر۔ مجاز لکھنوی
- وقت کی آواز۔ ناصر کاظمی
- ایک کھلنڈرا شاعر۔ جون ایلیا
- محبت اور انقلاب کا شاعر۔ احمد فراز
- ایک ہمہ جہت تخلیق کار۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان
- آبروئے صحافت۔ حمید کوثری

❖❖❖

◆◆◆

ایک خود فراموش شاعر — مجاز لکھنوی

معروف فرانسیسی نقاد طین (Taine) کا موقف یہ ہے کہ انسانی معاشروں کی تخلیقی قوتوں کا بھرپور اظہار اس کے ادب میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ادیب اس ماحول کی تخلیق ہوتا ہے جس میں وہ نشو و نما پاتا ہے۔ ایک خاص زمانی اور مکانی حدود میں مقید ہونے کے باعث وہاں رونما ہونے والے تمام منفی اور مثبت واقعات اس تخلیق کار پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ تخلیق کار کی ذہنی ساخت اور پرداخت میں ماحول اپنا بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے طین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہر مقام اور ہر عہد کا ادب ایک مخصوص نسل، ایک مخصوص ماحول اور ایک مخصوص لمحے کی تخلیق ہوتا ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میرؔ اور اقبالؔ کی شاعری میں بنیادی فرق دونوں کی نسلوں، ماحول اور صورتِ حال میں تھا۔ اس طرزِ احساس کے باعث ہمیں محض شاعر یا ادیب کے ذہنی رویوں پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ طین کے مطابق نسل (Race)، ماحول (Milien) اور لمحہ (Moment) کو بھی پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے کیونکہ ادب پارے کی تخلیق میں یہ تینوں عناصر بنیادی اور کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس پس منظر کی روشنی میں جب ہم اُردو کے معروف اور اپنے عہد کے مقبول شاعر **مجاز لکھنوی** کی صناعانہ شعری صلاحیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں طین کی تنقیدی بصیرت کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاز کی شعری اور فکری

صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں اس کی نسل اور ماحول کے ساتھ۔ساتھ اس لمحۂ خاص کا بھی ایک اہم کردار ہے۔اسی لیے تو وہ اپنے قارئین اور سامعین سے برملا کہہ رہے ہیں کہ

مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت

مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

اسرار الحق مجاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی یو پی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لکھنؤ، آگرہ اور علی گڑھ سے تعلیمی مدارج طے کیے اور پھر تلاشِ معاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ کچھ دنوں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کی اور پھر کچھ عرصہ اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت میں بھی اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔شراب نوشی کی عادت نے ان کے ذہن کو زرخیز اور جسم کو مضمحل کر دیا۔اردو شاعری کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کرنے والا یہ منفرد شاعر صرف چوالیس سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۵۵ء میں راہیِ ملکِ بقا ہوا۔مجاز بظاہر تو ہماری آنکھوں سے روپوش ہو گئے مگر اپنے عظیم تر تخلیقی سرمائے کے باعث وہ آج بھی باذوق قارئین کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ دنیاوی صدمات اور شراب نوشی نے ان کی عمر کو مختصر کر دیا اور فکر مند دنیا کا علاج کرنے والا شاعر یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا کہ

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے

وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

مجاز لکھنوی بے پناہ شعری صلاحیتوں کے مالک تھے۔انہوں نے اپنی خداداد استعداد کے باعث بہت جلد قبولیت عام کی سند حاصل کی۔ان کے دل میں انقلاب اور بغاوت کا الاؤ روشن تھا اور جب انہوں نے اپنے افکار کو شاعری کی زبان میں پیش کیا تو نوجوان نسل بطور خاص ان کی گرویدہ ہوگئی۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''آہنگ'' ۱۹۴۱ء میں

زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اپنے جدید طرزِ احساس کے باعث یہ مجموعہ بے حد مقبول ہوا اور اسی مجموعے کے باعث انہیں شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''سازِ نو'' ان کی رحلت سے دس برس قبل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا اور اسے بھی بے حد پذیرائی ملی۔ اپنے شعری سرمائے کی بدولت مجاز کو مختلف القاب سے نوازا گیا۔ کسی نے انہیں بلبلِ رنگیں نوا کہا، کسی نے انہیں اردو ادب کا شیلے اور کیٹس قرار دیا۔ کسی نے انہیں مغنیِ آتش نوا کہا اور کسی نے انہیں شہیدِ عشق قرار دیا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ مجاز لکھنوی نے اپنے آپ کو شاعرِ محفلِ وفا اور مطربِ بزمِ دلبراں قرار دیا ہے ؎

میں ہوں مجاؔز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں

بیسویں صدی برصغیر میں فکری، علمی اور نظری تبدیلیوں کی صدی تھی اور دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اردو شاعری نئے نئے رجحانات سے آشنا ہو رہی تھی۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکات نے اُردو شاعری کو نت نئے ذائقوں سے روشناس کرا دیا تھا۔ حالؔی اور آزؔاد نے انجمنِ پنجاب کے ذریعہ اُردو نظم کو ایک نئی راہ سے روشناس کرانے کی مشکور سعی کی تھی۔ اقبال، جوش اور اختر شیرانی نے رومانویت اور انقلاب کے حسین امتزاج سے اُردو شاعری کے مزاج کو تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسرار الحق مجاز کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو اس میں اقبال کا فلسفہ، اختر شیرانی کی رومانویت اور جوش کا طنطنہ موجود ہے۔ وہ اقبال کی طرح حرکت و عمل کے قائل تھے اور نوجوانوں کی سمت نمائی کو اپنا اولین فرض گردانتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''نوجوان سے خطاب'' کے صرف چار اشعار دیکھیے اور ان پر اقبال کے اثرات ملاحظہ فرمایئے:

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ وخشت سے چنگ ورباب پیدا کر
ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجم
وہ بانکپن وہ اچھوتا شباب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر

مجاز لکھنوی، اختر شیرانی کی رومانویت سے بے حد متاثر تھے وہ مرتے مر گئے لیکن اختر شیرانی کے دائرہ سحر سے باہر نہ نکل سکے۔ انہوں نے اختر شیرانی کی فکر سے بے حد استفادہ کیا مگر اختر شیرانی کے برعکس اپنی شاعری میں رومانویت کے ساتھ ساتھ عصری میلانات اور انقلابی رویوں کو بھی پیش کیا۔ اس طرح ان کی شاعری حسن وعشق اور رومانوی رجحانات کی عکاس ہونے کے باوجود آفاقی قدروں کی حامل ہوگئی۔ ان کے چند رومانوی اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے

....

سازگار ہے ہم دم، ان دنوں جہاں اپنا
عشق شادماں اپنا، شوق کامراں اپنا

....

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم

اب آپ مجاز کی ایک مشہور رومانوی غزل ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح

رومانوی طرزِ احساس کو پر لطف و پر اثر بنانے کی کوشش کی ہے۔

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اِک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سُونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری اور طنطنہ نے مجاز کو بے حد متاثر کیا۔ آپ کو مجاز کی شاعری میں جو انقلابی لے موجزن دکھائی دیتی ہے یہ سب جوش ملیح آبادی کا فیض ہے صرف دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دیکھ شمشیر ہے یا ساز ہے یا جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

....

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھیے
اُلجھے کبھی زمیں سے، کبھی آسماں سے ہم

اسرارالحق مجاز کو اپنے عہد میں معروف شعرا کے درمیان زندگی بسر کرنے کا موقع ملا۔ ان کے ہم عصر شعرا میں فانی بدایونی، میکش اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی ،عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر اور فیض احمد فیض شامل ہیں۔ مجاز نے تمام ہم عصر شعرا سے کسبِ فیض کیا لیکن اپنی علیحدہ راہ نکالی۔ یہی سبب ہے کہ ان شعرا کے ہجوم میں مجاز کی آواز بہ آسانی پہچانی جاسکتی ہے۔ آپ ''آہنگ'' اور ''سازِنو'' کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ مجاز کی غزلوں اور نظموں میں جدت بھی ہے اور کلاسیکیت بھی۔ جوش وجذبہ بھی ہے اور سادہ روی بھی۔ انقلابی رجحان بھی ہے اور نرم خرامی بھی۔ رومانویت بھی ہے اور فکر وفلسفہ کا رجحان بھی۔ حزن والم بھی ہے اور نشاطیہ کیفیات بھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ شعرا کی اس محفل عرفانی میں مجاز نے اپنے فکر واسلوب سے ایک نیا جہانِ معنی خلق کیا۔ وہ اس محفل میں آئے اور یہ کہتے ہوئے روانہ بھی ہو گئے کہ

اُس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اسرارالحق مجاز کی غزلوں میں ایک خاص طرح کی سرمستی ہے جو قارئین کے دلوں کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ اس سرمستی میں لطف اور نشاط کی کیفیات شامل ہو کر ان کی غزلوں کو معتبر مقام دلانے کا موجب بنتی ہیں۔ آپ ان کی مختلف غزلوں کے صرف تین اشعار ملاحظہ فرمایئے اور لطف اٹھایئے:

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس یونہی چلے آئے
یہ ملنا کوئی ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

....

یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے ہستی سے
آہ کی صدا نکلی، بربطِ شکستہ سے

....

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے، حسن بھی کیا رسوا ہوگا

اسرار الحق مجاز کی غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں بھی ایک نشاطیہ رجحان فراواں ہے۔ وہ اپنی نظموں میں محبوب کی کج ادائی پر شکوہ سنج بھی ہیں اور اس کے ترش رویوں پر نوحہ خواں بھی۔ وہ حالات کی چیرہ دستیوں پر آہ و بکا بھی کرتے ہیں اور زمانے کے مقابلے میں عزم و ہمت کا طوفان بن جانے کا مصمم ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ آپ ان کی ایک طویل نظم ''آوارہ'' ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ مجاز نے اردو نظم نگاری کو کیا کیا عطا کیا ہے۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی

جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لیے

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستان پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز کی نظموں میں جو جوش و جذبہ دکھائی دیتا ہے وہ دراصل ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ اس زمانے میں علی سردار جعفری اور جوش ملیح آبادی کی جوشیلی نظموں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ مجاز نے بھی اپنی شاعری کو انقلابی رویوں کا عکاس بنایا۔ وہ استعماری رویوں پر طنز بھی کرتے ہیں اور جبر و استحصال کرنے والی تمام قوتوں کو تباہ و برباد کرنے کا عزمِ صمیم بھی رکھتے ہیں۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے کہ شاید مجاز کی نظمیں محض ہنگامی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں یا وہ محض حسن و عشق کی عشوہ طرازیوں کا احاطہ کرتی ہیں یا وہ محض سماجی ناانصافی اور استبداد پر طنز کے تیر برساتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاز کی بہت سی نظمیں ایسی بھی ہیں جو فکری رویوں کی مظہر ہیں اور ان میں عقل و استدلال کے ساتھ اپنے موقف کی بھرپور وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم ''خوابِ سحر'' ملاحظہ فرمایئے اور اس کے رجائی نقطۂ نظر سے لطف اٹھایئے۔

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا

اک نہ اک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی

آسمانوں سے فرشتے بھی اترتے ہی رہے
نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

اہلِ سیف اٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب اٹھتے رہے اور آں جناب آتے رہے

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی

مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

اہلِ باطل علم سے سینوں کو گرماتے رہے

جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام

آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

اسرارالحق مجاز اپنے عہد میں ایک ''لیجنڈ شاعر'' کی حیثیت سے پہچانے جاتے رہے۔ ان کی شاعری کا چاروں جانب شہرہ تھا اور نوجوان نسل بطور خاص ان پر فریفتہ تھی۔ مجاز نے اپنی شاعری کے ذریعہ کوئی بڑا فلسفیانہ نظام تو پیش نہیں کیا اور نہ کسی بڑے اخلاقی نظام کی بنیاد رکھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ظلم وتمرد اور استعماری قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ رومان اور انقلاب کا حسین امتزاج پیش کیا۔ ایک ایسے عہد میں جہاں ترقی پسند شاعروں نے شاعری کو نظریے سے نعرہ میں تبدیل کر دیا تھا وہاں مجاز نے شاعری کو حظ ومسرت اور فکر وانبساط کا وسیلہ بنایا۔ انہوں نے گزشتہ عہد کی خرابیوں اور خامیوں کی محض نشاندہی نہیں کی بلکہ آنے والے خوشگوار زمانے کی نوید بھی سنائی۔ ان کے اسی رجائی نقطۂ نظر نے انہیں اپنے عہد کے شعرا سے ممتاز بنایا۔ کثرت شراب نوشی کے باعث مجاز دنیا سے جلد رخصت ہو گئے اور ہم ایک زرخیز ذہن رکھنے والے شاعر کے افکار ونظریات سے محروم ہو گئے لیکن اسرارالحق مجاز کی آواز آج بھی گونج رہی ہے۔

مری بربادیوں کا ہم نشینو

تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے معروف فرانسیسی نقاد طین کے حوالے سے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ایک شاعر کی عظمت کے پیچھے نسل، ماحول اور لمحہ کا کردار اساسی ہوتا ہے۔ اس نظریے کی روشنی میں ہم نے اُردو کے معروف اور مقبول شاعر اسرار الحق مجاز کی شاعری کا تجزیہ کرنے کی کاوش کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجاز نے اپنے بزرگوں کی جلائی ہوئی شمع کی لَو کو اپنے افکار و نظریات سے اور زیادہ فروزاں کرنے کی مشکور سعی کی ہے۔ مجاز کا اصل کارنامہ محض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کی رومانوی صداقتوں کو اُجاگر کر کے نوجوانوں کو متاثر کیا بلکہ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ آنے والے زمانے کو متاثر کرنے کی حتی الوسع کاوش کی۔ اگر آپ عمیق نگاہی سے ساحر، جذبی، مجروح، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، اختر الایمان وغیرہ کی شاعری کا مطالعہ فرمائیے تو آپ کو تمام شعرا پر مجاز کا جزوی یا کلی اثر ضرور مرتسم دکھائی دے گا۔ اگر آپ موجودہ دور میں بھی شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اسرار الحق مجاز کی شاعری کا بھرپور مطالعہ فرمائیے۔ اب یقیناً آپ کو ملال ہوگا کہ آپ ایسے "لیجنڈ شاعر" سے ابھی تک بے خبر کیوں رہے......؟؟ مجاز آپ کا استقبال کرتے ہوئے کہیں گے۔

آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز
ظلمت کدے میں شمعِ فروزاں لیے ہوئے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۲۳ دسمبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'آجکل' لاہور......۴ دسمبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۷ افروری، ۲۲ جنوری، ۲۹ جنوری ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

وقت کی آواز----ناصر کاظمی

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کسی معاشرے میں عقلیت اور معاشرتی نظم وضبط حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے خلاف شدید شخصی رد عمل ظاہر ہونے لگتا ہے اور انسان اپنی فطری آزادی اور نیکی کے حصول کے لیے معاشرتی جکڑ بندیوں سے نجات حاصل کر کے فطرت کی آغوش میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات اور معاشرتی اصول وضوابط کے مابین ہونے والی یہ کشمکش تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حوالوں سے اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں تو آزادی اور پابندی کے مابین حد فاصل ہوتی ہے لیکن غیر مہذب معاشروں یا تہذیبوں میں محض کسی ایک رجحان کے فروغ پانے سے بے شمار مسائل و معاملات جنم لیتے ہیں۔ فرد جب اپنی انفرادیت پر حد سے زیادہ زور دینے لگتا ہے تو وہ تمام معاشرتی بندھنوں سے خود کو آزاد کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال میں ایک رویہ یہ بھی جنم لیتا ہے کہ انفرادیت کی بنیاد پر ہر شخص شخصیت میں تبدیل ہونے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔ معاشرتی معیارات کو پسِ پشت ڈالنے والا انسان جلد ہی انفرادیت کے باعث ذہنی اور قلبی انتشار کا شکار ہو کر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ معروف نقاد ارونگ بیبٹ (Irving Babbit) نے واضح طور پر لکھا ہے کہ انفرادیت کے طلب گار رومانویوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ ٹھوس عملی دنیا کے بجائے خیالی دنیا کے

طلب گار ہوتے ہیں اور دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہوتا ہے لہٰذا یہ فاصلہ آخرکار اداسی، خودترحمی، ذہنی آشوب، فکری انتشار، یاسیت اور احساسِ تنہائی پر منتج ہوتا ہے۔ اس طرزِ احساس کے بعد معروف نقاد ٹی ایس ایلیٹ (T.S.Eliot) کا یہ موقف کسی حد تک قابل قبول ہو جاتا ہے کہ بڑا تخلیق کار محض وہ نہیں ہے جو انفرادیت کو فروغ دے بلکہ عظمت اس تخلیق کار کے حصے میں آتی ہے جو اپنی انفرادیت کو روایت کے سائے میں پروان چڑھائے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ ہر نئی نسل اپنے ساتھ نیا شعری مذاق لاتی ہے اور فن سے نئے مطالبات کرتی ہے۔ اب یہ تخلیق کار کی فنی وفکری صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ وہ روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اس سونے میں اپنا کتنا کھوٹ ملاتا ہے۔ اپنی شعری روایت پر عمل پیرا ہو کر اسے تروتازگی عطا کرنا ہی عظیم تخلیق کار کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اردو شعری روایت کو جلا بخشنے والوں میں ایک اہم ترین نام **ناصر کاظمی** کا بھی ہے جنہوں نے محض روایت کی پاسداری کا فریضہ ہی بطریقِ احسن ادا نہیں کیا بلکہ اپنے جدید تر افکار و نظریات کی بدولت ایک عظیم اردو شعری روایت کو زندہ و تابندہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اپنے افکار و نظریات کے باعث ناصر کاظمی کا نام اور کام ہمارے قلب و اذہان کی بالیدگی کا سبب ہے۔

ناصر کاظمی کا اصل نام سید ناصر رضا تھا۔ آپ کے والد ماجد سید محمد سلطان ایک نیک اور خدا ترس انسان تھے۔ ناصر کاظمی ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے اور یہیں ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ نوشہرہ چھاؤنی میں بھی مقیم رہے۔ انہوں نے لاہور میں اپنے تعلیمی مدارج بڑی محنت سے مکمل کیے۔ ناصر کاظمی کو موسیقی اور مصوری سے بے حد رغبت تھی۔ وہ شطرنج کے رسیا اور کبوتر بازی کے دلدادہ تھے۔ ناصر کاظمی نے عملی اور فکری طور پر تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا اور اپنے والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے لاہور میں مقیم ہو گئے۔ وہ اہلِ لاہور سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے

میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا

لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ معدنی

ناصر کاظمی تمام عمر لاہور ہی میں قیام پذیر رہے اور یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور میں اپنی جو پہلی غزل ترنم سے ریکارڈ کرائی اس کا مطلع یہ تھا۔

تمنا خون بن کر زیبِ مژگاں ہوتی جاتی ہے

بجھا جاتا ہے دل، ہستی فروزاں ہوتی جاتی ہے

لاہور میں ناصر کاظمی کے دوستوں اور احباب میں حمید نسیم، شہرت بخاری، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، عبدالمجید بھٹی، افتخار کاظمی، عبدالحمید، عابد علی عابد، ایم۔ ڈی تاثیر، غالب احمد، حنیف رامے، احمد مشتاق، مظفر علی سید وغیرہ اہم ہیں۔

ناصر کاظمی طویل علالت کے بعد ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو خالق حقیقی سے جا ملے اور لاہور ہی میں مدفون ہوئے۔ شاید وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے بارے میں کہہ گئے تھے کہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا

سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

ناصر کاظمی کا تخلیقی سفر تیرہ برس کی عمر سے شروع ہوا اور مرتے دم تک جاری رہا۔ انہوں نے عمر بھر شعر و ادب سے ناتا جوڑے رکھا اور ان کی درج ذیل تصانیف آج بھی ہمارے لیے قابلِ رشک ہیں :

(۱) برگِ نے (غزلیں) ۱۹۵۲ء

(۲) دیوان (غزلیں) ۱۹۷۲ء

(۳) پہلی بارش (غزلیں) ۱۹۷۵ء

(۴) نشاطِ خواب (نظمیں) ۱۹۷۷ء

(۵) سر کی چھایا (منظوم ڈراما) ۱۹۸۱ء

(۶) خشک چشمے کے کنارے (نثر) ۱۹۸۲ء

(۷) انتخاب میر ۱۹۸۹ء

(۸) انتخاب نظیر ۱۹۹۰ء

(۹) انتخاب ولی ۱۹۹۱ء

(۱۰) انتخاب انشا ۱۹۹۱ء

اس کے علاوہ ان کی کئی تصانیف زیر طبع ہے۔ ان کے صاجزادے اس سلسلے میں کوشاں ہیں۔

تقسیم برصغیر کے بعد اردو شاعری میں نئے نئے رجحانات و موضوعات نے جنم لیا تاہم دولخت ہونے کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کا ثقافتی اور ادبی ورثہ ایک ہی رہا۔ طرزِ احساس کی تبدیلی نے دونوں خطوں میں سوچ اور فکر کے نئے زاویے اُجاگر کیے۔ ناصر کاظمی کی شاعری اسی نئے طرزِ احساس کی نمائندگی کرتی ہے لیکن وہ جدید روّیوں کے علمبردار ہونے کے باوجود اپنی قدیم شعری روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ گزشتہ زمانے، یادیں، روایات اور افراد سے تعلق خاطر جوڑنے کے باعث بعض ناقدین نے انہیں ماضی پرست بھی قرار دیا ہے مگر وہ اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے کے تحفظ اور فروغ کے لیے مستعد اور آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

میں تو بیتے دنوں کی کھوج میں ہوں
تو کہاں تک چلے گا میرے ساتھ

بول اے مرے دیار کی سوئی ہوئی زمین
میں جن کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہیں وہ آدمی

....

کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینۂ نے میں چھپا دی ہم نے

....

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

....

وہ بھی اُداس اور مری رات بھی اُداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

....

کہیں اُجڑی اُجڑی سی منزلیں، کہیں ٹوٹے پھوٹے سے بام و در
یہ وہی دیار ہے دوستو، جہاں لوگ پھرتے تھے رات بھر

ناصر کاظمی اپنی شعری روایت سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور اسی رویے نے انہیں **میر تقی میر** کے قریب کر دیا ہے۔ ناقدین نے میر اور ناصر کاظمی کی ہجرت، ماحول اور شعری رویوں میں بے شمار مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ ناصر کاظمی نے میر کے افکارِ عالیات سے اپنی فکر کو جلا بخشی تاہم اپنی ادراکی صلاحیتوں کے باعث اپنے لیے ایک جدا راستہ تلاش کیا۔ زمانی اور مکانی بُعد نے بھی ناصر کاظمی کو میر تقی میر نہ بننے دیا اور وہ اپنے عہد کے رنگوں اور روشنیوں کو اُجاگر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دونوں شعرا کے طرزِ احساس میں یگانگت کے باوجود بھی بہت فرق موجود ہے۔ آپ ناصر کاظمی کے ان اشعار کا مطالعہ فرمائیے جو تقسیمِ برصغیر، نقل مکانی، ہجرت، اُداسی، بے کلی وغیرہ کے حوالے سے ہیں مگر یہ میر تقی میر کے شاعرانہ اسلوب سے لگا نہیں کھاتے۔ ملاحظہ فرمائیے :

زمیں لوگوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جائے

....

اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا

....

بجھی آتشِ گل اندھیرا ہوا
وہ اُجلے سنہرے ورق اب کہاں

....

فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا

....

پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

....

اُٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

....

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

....

چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصرؔ
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اُداسی ہے

ناصر کاظمی کی شاعری اور خصوصاً غزلوں کی شہرت وعظمت کا اصل سبب ان کا رومانوی لب ولہجہ تھا۔ وہ عشق میں غالب کی طرح محبوب کا دامن حریفانہ کھینچنے کے لیے تیار دکھائی دیتے ہیں اور اسی رویے نے ان کے عہد کے نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ یہ ہرجائی رنگ ناصر کی شاعری کو ایک نئے جہان میں لے جاتا ہے جہاں وہ حالات کی یورش سے دلبرداشتہ ہونے کے ساتھ ساتھ محبوب کے رویوں سے بھی دل گرفتہ نظر آتے ہیں ۔

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

....

مرا تو خوں ہو گیا ہے پانی، ستمگروں کی پلک نہ بھیگی
جو نالہ اٹھا تھا رات دل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

....

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

....

خیالِ ترکِ تمنا نہ کر سکے تو بھی
اداسیوں کا مداوا نہ کر سکے تو بھی
تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہو گا
مجھے یہ ضد کہ مداوا نہ کر سکے تو بھی

یہاں یہ بات محلِ نظر رہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری میں روایتی عشق ومحبت کے رنگ بھی ہویدا ہیں۔ وہ محبوب کے لب ورخسار کی مدح وستائش بھی کرتے ہیں اور اس کی خاطر اپنا تن، من دھن سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں

آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھرتھرائے
مہکی ہوئی سانس نرم گفتار
ہر ایک روش پہ گل کھلائے

....

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

ناصر کاظمی کی شاعری میں فطرت کے تمام رنگ اور آہنگ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ، صبح کے مناظر، چاند کی روشنی، ستارے، کہکشاں، طائر نغمہ سرا، درخت، پھول، پتیاں، گھاس، گھونسلے، شب کی اُداسی، طلوع وغروب کے مناظر، غرض تمام فطری مناظر ان کی شاعری میں تہذیبی عناصر کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ناصر کاظمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کے حسن سے اپنی شاعری کو کشید کیا ہے۔

یہ رات تمہاری ہے چمکتے رہو تارو
وہ آئیں نہ آئیں مگر اُمید نہ ہارو

....

کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتیاں محوِ یاس، گھاس اُداس

....

کئی دن رات سفر میں گزرے
آج تو چاند لبِ جُو نکلا

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
طائر نغمہ سرا غور سے سُن

وطن سے محبت ہماری اُردو شاعری کا ایک کلیدی موضوع رہا ہے۔ ناصر کاظمی ایک محبِ وطن انسان تھے۔ انہیں ایک جانب تو انبالے سے والہانہ عشق تھا اور دوسری جانب وہ لاہور سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ تقسیمِ برصغیر کے بعد انہوں نے ساری زندگی لاہور میں گزار دی۔ وہ پاکستان کے موسموں، باغوں، پرندوں، راتوں، دن، زمیں، آسمان، پھولوں غرض ہر چیز سے اُلفت رکھتے تھے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ وطن کی محبت میں کیسے کیسے گلہائے رنگا رنگ پیش کرتے ہیں۔

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

....

یہ آپ، ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے

....

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

....

آئینِ جاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی

....

جو گھر اُجڑ گئے ان کا نہ رنج کر پیارے
وہ چارہ کر کہ یہ گلشن اُجاڑ سا نہ لگے

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن
پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل

ناصر کاظمی کی شاعری نے جہاں علمی و ادبی حلقوں کو متاثر کیا وہاں نوجوان نسل ان کی غزلوں کے پر تحمل لہجے اور منفرد سوچ کے باعث ان پر فریفتہ ہوگئی۔ ناصر کاظمی بلاشبہ اختر شیرانی یا مجاز لکھنوی کی طرح مقبول عام و خاص تو نہ ہو سکے لیکن سنجیدہ ادبی حلقوں میں ان کی بے حد پذیرائی ہوئی اور ان کے سینکڑوں اشعار زبان زدِ عام و خاص ہوئے۔ ان کی مقبولیت میں ان کے دل پذیر اسلوب، الفاظ کے مناسب استعمال اور منفرد موضوعات کو خاص دخل ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ یہ اشعار ہر عہد اور ہر فکر کے لوگوں میں مقبول رہے ہیں۔

اے دوست ہم نے ترکِ تعلق کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

....

مایوس نہ ہو اُداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبحگاہی

....

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

....

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

....

دل تو میرا اُداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں
تو بھی دل سے اُتر نہ جائے کہیں

....

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے

....

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصؔر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

....

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصؔر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

....

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

....

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

ناصر کاظمی کے حوالے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔ بیشتر ناقدین نے ناصر کاظمی کے سطحی مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ ناصر کاظمی اور میر تقی میر میں بے شمار مماثلتیں ہیں لہٰذا وہ اپنے افکار و اسالیب کے باعث عصرِ حاضر کے میر تقی میر ہیں۔ ناصر کاظمی کی شاعری کے عمیق مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ناصر

کاظمی محض میرؔ سے متاثر نہیں تھے بلکہ ان کی شاعری پر غالب، اقبال، فیض، جگر، فراق اور حفیظ ہوشیار پوری کے اثرات بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ میر، غالب اور اقبال کے شاعرانہ محاسن کا پرتحمل اظہار ناصر کاظمی کی شاعری کا بطورِ خاص وصف ہے۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں ذاتی کرب بھی ہے اور معاشرتی آشوب بھی۔ تاہم ان کا ہر شعر ان کی کسی نہ کسی قلبی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ ناصر کاظمی کا سب سے بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو آپ بیتی بنا دیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی شکل میں ایک ایسا آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس میں ہم اپنی اور اپنے عہد کی تصاویر دیکھ سکتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے شعوری کوشش کی ہے کہ وہ اپنے عہد کی جملہ روایات واقدار کو انتہائی سلیقے اور قرینے سے اپنی شاعری میں محفوظ کر دیں اور ان کا سلسلہ اپنی گزشتہ تہذیبی روایات و اقدار سے جوڑ دیں، وہ اس کاوش میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا بہترین فیصلہ ان کی شاعری کے عمیق مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بہرحال اپنی جگہ مسلم ہے کہ پاکستان میں اُردو غزل کی تاریخ ناصر کاظمی کے ذکر کے بغیر اُدھوری رہے گی اور ان کا یہ دعویٰ کسی حد تک سچ ثابت ہو جائے گا کہ ؎

ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں فرد کے جذبات و احساسات کی قدر بھی کی جاتی ہے اور معاشرتی اصول و ضوابط کی پابندی بھی۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد فرد کی آزادی کے تو خوب نعرے لگے مگر فرد کے نظم و ضبط کے بارے میں خاطر خواہ فیصلے نہ کیے جا سکے۔ اس رومانوی طرزِ احساس نے ہماری شاعری کو بھی متاثر کیا اور ہمارے بیشتر شعرا اسی رویے کا شکار ہو گئے۔ ناصر کاظمی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کی شعری

روایت کو اردو کی پُر تجمل روایت سے منسلک کر دیا۔ اس طرح اب پاکستان کی شعری روایت کو برصغیر کی عظیم الشان اور پُر رفعت شعری روایت کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے اور ناصر کاظمی کی شاعری کے سینے میں وقت کی آواز کی دھڑکن آج بھی سنی جا سکتی ہے۔

عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصرؔ
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

مطبوعہ

(روز نامہ 'دن' لاہور......۲۹ دسمبر ۲۰۰۸ء)

(روز نامہ 'مساوات' لاہور......۲۴ جنوری ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

ایک کھلنڈرا شاعر — جون ایلیا

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی عظیم تہذیب کی تشکیل میں وہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور لسانی رویوں کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ یونان، انگلستان اور برصغیر کے عظیم اور پُرعظمت تہذیبوں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ درج بالا تمام امور کے ملاپ ہی سے ایسی عظیم المرتبت تہذیبیں وجود میں آتی ہیں۔ برصغیر کی تہذیبی روایات کو جلا بخشنے میں امروہہ کا کردار بے مثال ہے۔ یہاں کی تخلیقی مٹی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ کنکر کو بھی ہیرا بنا دیتی ہے۔ اس عظیم خطۂ ارضی نے یوں تو غلام ہمدانی مصحفی سے لے کر خیال امروہوی تک سینکڑوں تخلیق کاروں کو جنم دیا تاہم اس زرخیز امروہہ سے ایک ایسا خانوادہ بھی ظہور پذیر ہوا جس نے جملہ فنونِ لطیفہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث خوب نام کمایا۔ اس خانوادے کے سید محمد تقی فلسفی نے فلسفہ میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ صادقین نے مصوری اور خطاطی میں پوری دنیا میں شہرت حاصل کی۔ نسیم امروہوی نے شعر و ادب اور خصوصاً صنفِ مرثیہ میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ لائق صد تحسین ہیں۔ رئیس امروہوی کی افتادِ طبع اور شعری صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ اسی علمی ادبی اور ثقافتی خانوادے میں ایک منفرد شاعر **جون ایلیا** بھی

موجود ہیں جنہوں نے اپنے منفرد شعری تجربات اور سحر انگیز شخصیت کے باعث اس خاندان کی عزت، عظمت اور شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے منفرد شخصی اوصاف اور یگانہ شعری خدمات کے باعث جون ایلیا کا نام اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔

سید جون اصغر المعروف بہ **جون ایلیا** ۱۹۳۵ء میں امروہہ یوپی کے ایک علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد علامہ شفیق حسن ایک عالم دین اور صاحبِ طرز شاعر تھے۔ جون ایلیا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر مروجہ تعلیم کی تکمیل کے بعد مختلف جگہوں پر ملازمتیں کرتے رہے۔ شعری ذوق ورثے میں پایا تھا لہٰذا کم سنی میں شاعری کی جانب رجوع ہوئے۔ صحافت سے بھی تعلق جوڑا لیکن اپنے فطری میلان کے باعث زیادہ دیر تک کسی ادارے سے منسلک نہ رہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد کراچی ان کا مستقر ٹھہرا۔ اپنی افتادِ طبع کے باعث انہوں نے اپنے شعری سرمایے کو بھی محفوظ نہ رکھا۔ ان کی طبیعت میں درویشی اور لا اُبالی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ استغنا کی دولت سے مالا مال تھے اور اسی باعث انہیں دنیاوی دولت، شہرت یا جاہ وعظمت کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔ وہ خود کہتے ہیں۔

نہیں دنیا کو جو پروا ہماری
تو پھر دنیا کی کیوں پروا کریں ہم

جون ایلیا اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں فارسی اور عربی الفاظ انتہائی سلیقے اور دانش مندی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ جون ایلیا کو پاکستان میں اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ اپنی منفرد شخصیت اور یگانہ شعری ادائیگی کے باعث بہت شہرت ملی۔ جون ایلیا کی شخصیت ہر دور میں متنازعہ رہی۔ انہوں نے خود کو دنیاوی معاملات سے دور رکھا اور اسی باعث انہیں وہ شہرت حاصل نہ ہو

سکی جس کے وہ حقدار تھے۔ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک جانب تو ہم جوہرِ قابل کی کمی کا رونا روتے ہیں اور دوسری جانب جوہرِ قابل کو مٹی میں رول دیتے ہیں۔ جون ایلیا کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے اپنے طرزِ عمل کے باعث دنیاوی شہرت حاصل کرنے کے ذرائع سے خود کو دور رکھا یا دوسرے معنوں میں یوں کہہ لیجیے کہ جون ایلیا کو معاشرے نے کم نقصان پہنچایا تاہم ان کی اپنی ذاتی ''بے رُخی'' کے باعث انہیں زیادہ نقصان پہنچا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

خود اپنے عشوہ و انداز کا شہید ہوں میں
خود اپنی ذات سے برتی ہے بے رُخی میں نے

جون ایلیا کے شعری جوہر صنفِ غزل میں کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ اپنے منفرد شعری ذوق کے باعث انہوں نے غزل کو نئے نئے موضوعات و اسالیب سے مالا مال کیا۔ ان کے درج ذیل شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

(۱) شاید (۱۹۹۰ء)
(۲) یعنی (۲۰۰۳ء)
(۳) گمان (۲۰۰۴ء)
(۴) گویا (۲۰۰۸ء)

آپ جون ایلیا کے درج بالا تمام مجموعوں کے سنینِ اشاعت ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ ایک شاعر نے اوائل عمر سے شاعری کا آغاز کر دیا تھا لیکن اس کا پہلا مجموعہ بچپن برس کی عمر میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تو اس کا بنیادی سبب کیا تھا......؟؟؟ میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا سبب جون ایلیا کی افتادِ طبع اور بے پروائی تھی۔ وہ اپنا ضمیر ہنر بیچنے کے متمنی نہ تھے۔ ان کی غزلیں اخبارات و جرائد میں تو چھپتی رہتی تھیں لیکن وہ اپنا شعری

مجموعہ شائع کرنے سے خائف رہتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

کیا مل گیا ضمیرِ ہنر بیچ کر مجھے
اتنا کہ صرف کام چلاتا رہا ہوں میں

اب جون ایلیا کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ناقدین اور محققین کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیں اور جون ایلیا کے مقام و مرتبے کا بارِ دگر تعین کریں۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا تو آنے والا وقت اسے ہماری بدنیتی پر محمول کرے گا۔

جون ایلیا ایک کھلنڈرے (Carefree) انسان تھے۔ انہیں دنیا اور اس سے متعلقہ معاملات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ دنیا کو ایک تماشائی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مزاج و مذاق اور شعری کائنات میں ''دنیا بیزاری'' کے آثار نمایاں ہیں۔ تاہم جون ایلیا کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ دنیا کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی تھے مگر آج اہلِ عالم کی نگاہ میں خود تماشا بن چکے ہیں۔

برہنہ ہیں سرِ بازار تو کیا
بھلا اندھوں سے پردا کیوں کریں ہم

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جون ایلیا اتنے دنیا بیزار کیوں تھے......؟؟؟ میرے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جب معاشرے میں انتشاری قوتیں فروغ پا رہی ہوں تو انسان اپنے اندر سمٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی اپنی ذات اس کا مرکز و محور بن جاتی ہے اور وہ چشمِ تصور سے کائنات کو دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص معاشرتی حدود و قیود کو توڑ کر اپنی ذات کا ایک نیا دائرہ وضع کر لیتا ہے اور نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر اسی دائرے میں گھومتا رہتا ہے۔ جون ایلیا نے بھی اپنے گرد ایک ایسا ہی خود ساختہ دائرہ کھینچ لیا تھا اور وہ عمر بھر اسی کے گرد گھومتے رہے۔ وہ خود

اس صورتِ حال سے غیر مطمئن تھے مگر وہ خواہش کے باوجود اپنے حصار سے باہر نہ نکل سکے۔ وہ خود اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں۔

جو اک نسل فرومایہ کو پہنچے
وہ سرمایا اکٹھا کیوں کریں ہم

دانش مند جانتے ہیں کہ افلاطون نے اخلاقیات اور صداقت کے نام پر بے شمار شعرا کو اپنی وضع کردہ مثالی ریاست سے باہر نکالنے کا حکم صادر فرمادیا تھا جبکہ معروف امریکی نقاد ایڈگر ایلین پو نے (Edgar Allan Poe) نے جمالیات کے نام پر بے شمار معلمانِ اخلاق وصداقت کو اپنی مملکتِ شعر کی حدود سے خارج کر دیا۔ جون ایلیا کا نقطۂ نظر بھی ایڈگر ایلین پو کے قریب تر ہو جاتا ہے کہ وہ بھی پوَ کی طرح فن پارے کو شعوری کاوش کا حاصل سمجھتے ہیں تاہم وہ پو کے برعکس شاعری کو ایک خاص طرح کی ''جنونی کیفیت'' کا اظہار سمجھتے ہیں۔ آپ جون ایلیا کی شاعری کا مطالعہ کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں اخلاقیات اور دینیات کے برعکس اپنی ذاتی کیفیات کا اظہار انتہائی شدت سے ہوا ہے۔ شدید جذبات کے شدید اظہار کے باوصف ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کا لطف پیدا ہو گیا ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔

وفا، اخلاص، قربانی، محبت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم

....

عمر گزرے گی امتحان میں کیا
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا

....

ایک ہی فن تو ہم نے سیکھا ہے
جس سے ملیے اسے خفا کیجیے

جون ایلیا کے کلام میں ایک خاص طرح کی جھلاہٹ، اکتاہٹ اور بیزاری ہویدا ہے۔ یہ بیزاری ذاتی آلام کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور معاشرتی مسائل کا بھی۔ وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ معاشرتی رسوم و رواج پر بھی طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ان کی یہ برہمی دراصل ان کی خواہشات کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرزِ احساس کے باعث وہ اردو کے معروف شاعر یاس یگانہ چنگیزی کے قریب ہو جاتے ہیں۔ جون ایلیا خود احتسابی کے بھی قائل ہیں اور معاشرتی اصلاح کے بھی متمنی ہیں لیکن ان کا اصلاحی رویہ الطاف حسین حاؔلی کی اصلاحی اور مقصدی تحریک سے بہت مختلف ہے۔ ان کی یہ جھنجھلاہٹ دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ معاملات کو اپنی خواہشات کے مطابق نہیں پاتے ہیں۔ میرے خیال میں جون ایلیا کا یہی رویہ انہیں ہم عصر شعرا سے منفرد بنا دیتا ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار دیکھیے اور ان میں ترشی اور جھنجھلاہٹ محسوس کیجیے ؎

میں تو صفوں کے درمیان، کب سے پڑا ہوں نیم جاں
میرے، تمام جاں نثار، میرے لیے تو مر گئے

....

نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم

....

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

....

محبت میں ہمیں پاسِ انا تھا
بدن کی اشتہا صادق نہ تھی کیا

....

نظر پر بار ہو جاتے ہیں منظر
جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو

....

شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی
لیکن یقین سب کو دلاتا رہا ہوں میں

....

ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی
سو خود پر بھی بھروسا کیوں کریں ہم

....

جدائی اپنی بے روداد سی تھی
کہ میں رویا نہ تھا اور پھر ہنسا نئیں

جون ایلیا ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ان کا خیال تھا کہ شعروادب کو معاشرتی روّیوں کا عکاس ہونا چاہیے۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں عصری حسیّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔اگر آپ ان کی شاعری کا بنظرِ غائر مطالعہ فرمایئے تو آپ کو فوراً محسوس ہوگا کہ جون ایلیا ایک حساس ذہن کے مالک ہیں اور وہ سماجی ناانصافی، عدم مساوات اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف مسلسل صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔اس صورتِ حال میں ان کی شاعری احتجاجی روپ دھار لیتی ہے۔وہ انسانی دکھوں کی کہانی انتہائی دلدوز انداز میں پیش کرتے ہیں تاہم یہ بات پیش نظر رہے کہ اس موقع پر ان کا لب ولہجہ نرم اور شیریں رہتا ہے۔اسی باعث بیشتر ناقدین نے انہیں ''حساس غزل گو'' قرار دیا ہے۔جون ایلیا کی شاعری میں روحِ عصر بھی پوشیدہ ہے۔انھوں نے ایک ماہر نباض کی طرح معاشرے کے تمام منفی رُخوں کا احاطہ کیا ہے اور ان کی اصلاح کے لیے مفید تجاویز بھی پیش کی ہیں تاہم ان کا لہجہ کہیں بھی مصلحانہ یا

واعظانہ نہیں ہوتا۔ آپ جون ایلیا کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح عصری مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

....

ملتے رہیے اسی تپاک کے ساتھ
بے وفائی کی انتہا کیجے

....

یہ اکثر تلخ کامی سی رہی کیا
محبت زک اُٹھا کر آئی تھی کیا

....

یہ بستی ہے مسلمانوں کی بستی
یہاں کارِ مسیحا کیوں کریں ہم

....

سخت زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاسدار
اُڑ کے بلندیوں میں ہم گردِ ملال ہو گئے

....

بہت دشوار ہو جائے گا جینا
یہاں تو ذات کے اندر نہ رہیو

....

یہاں معنی کا بے صورت صلا نئیں
عجب کچھ میں نے سوچا ہے لکھا نئیں

....

کہیں چھپ جاؤ تہہ خانوں میں جا کر
شب فتنہ ہے اپنے گھر نہ رہیو

جون ایلیا کی شاعری میں روایتی کلاسیکی رنگ و آہنگ بھی موجزن ہے۔ وہ ہجر و وصال کی کیفیات بھی بیان کرتے ہیں اور محبوب کی بے اعتنائی کا شکوہ بھی کرتے ہیں۔ انہیں عشق کی بے پناہ صعوبتوں کا بھی احساس ہے اور وہ عاشق صادق کی مجبوریوں سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہیں تاہم لطف کی بات یہ ہے کہ وہ عشقیہ موضوعات کی پیش کش میں بھی اپنی انفرادی وضع قطع برقرار رکھتے ہیں۔ وہ محبوب سے شکوہ بھی کرتے ہیں تو اپنا جداگانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور عشق کے جذبات اُجاگر کرنے کے لیے اپنے عمیق تجربات کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ حسن و عشق کے موضوعات سے مملو جون ایلیا کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم
تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم

....

بچھڑ کے جان تیرے آستاں سے
لگایا جی بہت پر جی لگا نئیں

وہ ہجر و وصل تھا سب خواب در خواب
وہ سارا ماجرا جو تھا وہ تھا نئیں

....

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

....

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

....

سویرے ہی سے گھر آ جائیو آج
ہے روزِ واقعہ باہر نہ رہیو

....

نہیں ہے اب مجھے تم پر بھروسہ
تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی کیا

....

کتنے ہی نشہ ہائے ذوق، کتنے ہی جذبہ ہائے شوق
رسمِ تپاکِ یار سے رو بہ زوال ہو گئے
مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجیے

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جون ایلیا اپنے مزاج و مذاق اور موضوعات و اسالیب کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں سے بے حد مختلف اور یگانہ تھے۔ انہوں نے اپنی قوتِ متخیلہ سے نئے نئے موضوعات تراشے تھے اور اپنے محسوسات اور تجربات کی روشنی میں شاعری کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا تھا۔ آپ ان کے چاروں شعری مجموعوں کا مطالعہ فرما لیجیے آپ کو خود محسوس ہو گا کہ جون ایلیا اپنے لیے علیحدہ شعری جہان وضع کر رہے ہیں۔ ان کی غزلوں میں یہ انفرادیت محض دوسرے شعرا سے جدا یا

ممتاز نظر آنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ جون ایلیا کی افتادِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے خود اپنے ایک شعر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ؎

خود کو دنیا سے مختلف جانا
آ گیا تھا مرے گمان میں کیا

چیزوں کو ایک نئے تناظر میں دیکھنا ایک تخلیقی عمل ہے اور جون ایلیا کا یہ عمل انہیں شعری کائنات میں بلند مقام عطا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور سوچیے کہ ایسے اشعار ہماری اردو شاعری میں کہیں موجود ہیں؟؟؟

کل دوپہر عجیب سی اک بے دلی رہی
بس تیلیاں جلا کے بجھاتا رہا ہوں میں

....

تو بھی کسی کے باب میں عہد شکن ہو غالباً
میں نے بھی ایک شخص کا قرض ادا نہیں کیا

....

قربِ جمال اور ہم، عیشِ وصال اور ہم
ہاں یہ ہوا کہ ساکنِ شہرِ جمال ہو گئے

....

اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم

....

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

....

نطقِ حیوان پر گراں ہے ابھی
گفتگو کم سے کم کیا کیجے

....

سفر کرنا ہے آخر دو پلک بیچ
سفر لمبا ہے بے بستر نہ رہیو

....

شکستِ اعتمادِ ذات کے وقت
قیامت آ رہی تھی آ گئی کیا

....

کبھی خود سے مکر جانے میں کیا ہے
میں دستاویز پر لکھا ہوا نئیں

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ کسی بھی عظیم تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں وہاں کے فنونِ لطیفہ اپنا مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ خاص طور پر شعر و ادب مہذب معاشرے کی تخلیقی قوتوں کا اظہار یہ ہوتا ہے اور کوئی بھی تخلیق کار اس ماحول کی تخلیق ہوتا ہے جس میں وہ پروان چڑھتا ہے۔ جون ایلیا نے امروہہ جیسے مردم خیز خطۂ ارضی میں جنم لیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ہموار کیا۔ نسلی اور موروثی افتخار، علمی، ادبی اور تخلیقی ماحول اور ذاتی میلانِ طبع کے باعث وہ آسمان پر ایک روشن آفتاب بن کر اُبھرے اور اپنی روشنی سے ایوانِ شعر و ادب کو جگمگاتے رہے۔ شاید، یعنی، گمان اور گویا محض ان کے شعری مجموعے ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں ہماری عظیم ترین تہذیبی روایات محفوظ ہیں۔ جون ایلیا کی شاعری میں ان کی ذات بھی منعکس ہوتی ہے اور معاشرتی روّیے بھی۔ ان کی شاعری کو ایک ایسے سمندر سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو کبھی انتہائی تند، تیز اور پر شور ہو جاتا ہے اور کبھی انتہائی ساکت اور پرسکون۔ یہی دونوں

روّیے اور لہجے جون ایلیا کی شاعری کا منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔ آج اُردو شاعری میں جون ایلیا اپنے رنگا رنگ اور منفرد موضوعات اور ہمہ جہت اسلوب کے باعث صاحبانِ نقد ونظر کی نگاہ میں معتبر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب ان کا تمام نثری وشعری سرمایا محفوظ ہے اور وہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے رہنما ثابت ہوگا اور اس کی روشنی سے نیا جہانِ معنی تخلیق ہوگا۔ جون ایلیا کو یقین ہونا چاہیے کہ ان کی آئندہ نسل فرومایہ نہیں بلکہ ان کی قدر دان ہے اور وہ اپنا سرمایہ بصد مسرت اور اطمینان اس نسلِ نو کے حوالے کر سکتے ہیں اور اب انہیں اپنے قارئین سے یہ شکوہ نہیں کرنا چاہیے کہ :

میری ہر بات بے اثر ہی رہی
نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا

مطبوعہ

(روزنامہ 'آجکل'......۱۳/دسمبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور......۱۵ مئی ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

محبت اور انقلاب کا شاعر۔ احمد فراز

اس کائناتِ رنگ و بو میں ایسے شعرا کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی شعروادب کی ترویج کے لیے وقف کر دی ہو۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب شاعری کے پیرائے میں اپنا اظہار کرتا ہو۔ یہی سبب ہے کہ جب کسی نے ناصر کاظمی سے سوال کیا کہ ایک حقیقی شاعر صحیح معنوں میں شاعر کب ہوتا ہے؟؟ تو ناصر کاظمی نے مسکرا کر کہا کہ شاعر تو ہاتھ دھوتے ہوئے بھی شاعر ہوتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ شاعری بھی نبوت کی طرح کل وقتی کام ہے۔ احمد فراز ان چنیدہ شعرا میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے عمر بھر شاعری کی اور شاعری کے سوا کچھ نہیں کیا۔

فراؔز تو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحب زر اور صرف شاعر تو

معروف انگریزی نقاد ٹی ایس ایلیٹ کا مؤقف یہ ہے کہ بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کو متاثر کرے۔ ہم مشرقی لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ ہم شاعری میں محض عصری تقاضوں اور عصری حسیّت کو تلاش کرتے رہتے ہیں اور حالاتِ حاضرہ سے متعلق مبصرانہ شاعری کو عظیم شاعری قرار دے کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم شاعری محض حال اور مستقبل پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ وہ ماضی کی بنی ہوئی ترتیب کو

بھی توڑ دیتی ہے۔ احمد فراز کا وصف محض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے بلکہ انہوں نے ماضی و مستقبل کو بھی اپنی شاعری میں یکجا کر دیا ہے۔ اس طرح عصرِ حاضر میں **احمد فراز** وہ قابلِ توجہ شاعر ہیں جن کی شاعری میں ماضی، حال اور مستقبل کے تمام رویّے اور رجحانات یکجا ہو گئے ہیں۔ اس طرح ہم احمد فراز کو ماضی سے ربطِ خاص کے باعث روایات پسند شاعر، حال سے تعلق خاطر رکھنے کے سبب معاشرتی رویّوں کا عکاس شاعر اور مستقبل سے منسلک ہونے کے باعث امکانات کا شاعر قرار دے سکتے ہیں۔ آپ احمد فراز کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمالیجیے تو آپ کو اس میں تینوں زمانے تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ احمد فرز نے کٹھن راستوں پر جس طرح شعری سفر طے کیا ہے اس کی روداد ان کی زبان سے سنیئے تاہم یہ وہ مقام ہے جہاں احمد فراز کا کوئی ہم سخن دوست یا ساتھی کوشش کے باوجود نہ پہنچ سکا ۔

کیسے رستے سے چلے اور کس جگہ پہنچے فراز
یا ہجومِ دوستاں تھا ساتھ یا کوئی نہیں

تقسیمِ برصغیر کے بعد اردو شاعری کئی ذائقوں سے آشنا ہوئی۔ ایک جانب تو ناصر کاظمی کا اُداس لہجہ اُبھرا جس نے اُردو شاعری میں میر تقی میر کی یاد کو تروتازہ کر دیا۔ اس یاسیت نے ہماری شاعری کو انفعالی کیفیات سے دوچار کر دیا۔ دوسری جانب یاس یگانہ چنگیزی کے باعث شاعری میں تند اور ترش لہجہ نمودار ہوا جس میں ایک خاص طرح کی کاٹ موجود تھی۔ شکیب جلالی نے اس لہجے کو اپنی شاعری کا مقصود بنایا۔ تیسری سمت انقلابی لب و لہجے کو فروغ حاصل ہوا اور ترقی پسند شاعری کے باعث ظہیر کاشمیری اور اسی قبیل کے دیگر شعرا نے شاعری کو انقلابی نعرے میں تبدیل کرنے کی شعوری کوشش کی۔ چوتھی جانب روایت شکن شاعر نمودار ہوئے جنہوں نے شاعری اور خصوصاً غزل میں ہیئت اور موضوعات کی تبدیلی پر زور دیا۔ اس صورتِ حال کے باوصف ایک جانب میرا جی، راشد، امجد اور خالد

وغیرہ نے شاعری کے مزاج اور ہیئت کو یکسر تبدیل کر دیا۔ دوسری جانب ظفر اقبال نے اپنی غزلوں کے ذریعہ اس صنف کو نئے نئے ذائقوں اور اسالیب سے آشنا کیا۔ ہیئت اور موضوعات کی تبدیلی نے شاعری کو تو تبدیل کر دیا لیکن قارئین کے اذہان تبدیل نہ ہو سکے۔ جدید شاعری نے اپنے علمی دبدبے سے کلاسیکی شاعری کو دبانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور کلاسیکی شعری شجر بار بار کٹنے کے باوجود پھلتا پھولتا رہا۔ ان چاروں رویوں کے ساتھ ساتھ غالب کی تاسّی میں فیض احمد فیض نے ایک دلکش اور دلربا لہجہ اختیار کیا۔ انہوں نے رجائی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسان کے جذبات واحساسات کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی روایات اور گمشدہ تہذیب کی بازیافت کی اور اپنے خونِ جگر سے اس تہذیب اور روایت کو ایک نیا ذائقہ عطا کیا۔ اگر آپ فیض کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیجیے تو آپ کو اس میں درج بالا تمام شعری ذائقوں کا امتزاج محسوس ہوگا۔ فیض کی اس شعری روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ایک اہم نام احمد فراز کا بھی ہے۔ احمد فراز نے ہوشیاری یہ کی کہ اپنی شاعری کو عمیق موضوعات اور فلسفیانہ موشگافیوں کی نذر نہ ہونے دیا بلکہ عمومی جذبات واحساسات کو ایک خاص سطح سے پیش کرنے کی مشکور سعی کی۔ احمد فراز نے نوجوانوں کے لہو کو گرم رکھنے کے لیے محبت کو اپنی شاعری کا مرکزی نقطہ بنایا۔ اسی طرح انہوں نے انقلاب کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ اگر آپ چشمِ بصیرت سے مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ احمد فراز کی پوری شاعری محبت اور انقلاب سے مالا مال ہے۔ احمد فراز نے دل کی صدا پر ان دونوں موضوعات کو حرزِ جاں بنائے رکھا۔ محبت اور انقلاب کے اس شاعر نے دنیاوی طعن وتشنیع سے لاتعلق ہو کر دل کی صدا پر شاعری کی اور اسی باعث نوجوانوں میں مقبول بلکہ بہت مقبول ہو گیا اور اس کا اپنا شعر ایک نظریہ بن گیا کہ ؎

دشت غربت میں تمہیں کون پکارے گا فرازؔ
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

احمد فراز ایک سنجیدہ فکر اور مکمل شاعر تھے۔ انہوں نے ساری زندگی شعروادب سے ناتا جوڑے رکھا اور اپنے شائقین کو تیرہ شعری مجموعے عطا کر گئے۔ ان کے معروف مجموعوں میں تنہا تنہا، درد آشوب، نایافت، جاناں جاناں، شب خون، میرے خواب ریزہ ریزہ، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، پس انداز موسم، سب آوازیں میری ہیں، خوابِ گل پریشاں ہے، بودلک، غزل بہانہ کروں شامل ہیں۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً ان کے تین کلیات ''اثاثہ''، ''کلیات احمد فراز'' اور ''شہرِ سخن آراستہ ہے'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر قارئین اور ناقدین سے بے پناہ داد سمیٹ چکے ہیں۔ امکان ہے کہ اب ان کی رحلت کے بعد ان کا بچا کھچا شعری سرمایہ بھی جلد شائع ہو جائے گا۔ ان تمام مجموعوں کے مطالعہ کے بعد ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم احمد فراز کی شاعری کا حقیقی مقام ایک مرتبہ پھر متعین کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کا فنی وفکری مرتبہ ان کی شخصیت سے جدا ہوکر ہمارے سامنے آجائے۔

احمد فراز کو کئی چیزوں نے شہرت عطا کی۔ ان کے اسلوب کی مٹھاس نے محبت کرنے والے دلوں میں گداختگی پیدا کی۔ ہر عمر اور ہر مذاق کے انسان کے لیے احمد فراز کی شاعری میں لطف وانبساط کی کئی کیفیات پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح معروف گلوکاروں نے احمد فراز کی بے مثال غزلوں کو لافانی بنا دیا اور آج بھی ان کی غزلوں کے سینکڑوں اشعار زبان زد عام وخاص ہیں۔ مشاعروں کے باعث بھی احمد فراز کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے مجموعوں اور کلیات کی متواتر اشاعت نے بھی احمد فراز کو قارئین کے دلوں میں تروتازہ رکھا۔ انہوں نے پوری دنیا میں اپنی شاعری کی بدولت حکمرانی کی اور تقریباً نصف صدی تک نوجوانوں کے دلوں پر راج کرتے رہے۔ انہوں نے محبت کے گیت گائے اور استعمار اور ظالم قوتوں کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم نہ کرنے کا بار بار اعلان کیا۔ قید وبند کی صعوبتوں نے بھی احمد فراز کے عزمِ صمیم کو کم نہ ہونے دیا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ احمد فراز کی شاعری

کوئی بڑا اور منضبط فلسفیانہ نظام مرتب نہیں کر سکی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری سے کسی اخلاقی نظام کی تلاش بھی بے سود ہے۔ آپ کو ان کی شاعری میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع بھی نہیں ملے گا مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم ہے کہ احمد فراز اردو شاعری کے ایک ایسے نابغہ ہیں جن پر ہمارا عہد فخر کرے گا۔ وہ ہماری نگاہوں سے تو اوجھل ہو گئے ہیں مگر ان کی دلکش یادوں اور میٹھی میٹھی باتوں سے ہمارے دل اور دماغ آج بھی تروتازہ ہیں۔

بہت دنوں سے نہیں ہے کچھ اس کی خیر خبر
چلو فراز کو اے یار، چل کے دیکھتے ہیں

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۹ ستمبر۔ ۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور......۸ ستمبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'جناح' لاہور......۲۷؍اگست ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

ایک ہمہ جہت دانشور۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان

ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ہر شعبۂ حیات رو بہ زوال ہے۔ یہ صورت حال اس وقت مزید المناک ہو جاتی ہے جب کوئی صاحبِ اسلوب انسان دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ پُر کرنے والا دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ آپ فنون لطیفہ کے کسی بھی شعبہ کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمالیجیے آپ دیکھیں گے کہ ہر معتبر تخلیق کار کے اُٹھ جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے بھرنا شائد اب ہمارے اختیار ہی میں نہیں ہے۔ شعر و ادب کا معاملہ اور بھی ابتر ہے۔ سنجیدہ فکر شاعر اور ادیب عوام کی نگاہ میں غیر مقبول ٹھہرتے ہیں اور مقبول شعرا فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ میرے خیال میں بڑی اور عظیم تخلیق ہمیشہ تہذیب یافتہ معاشرے میں پیدا ہوتی ہے۔ ہم لوگ کسی گمشدہ تہذیب کے باشندے ہیں۔ ہم اپنی تہذیب ہی نہیں اپنی شناخت بھی کھو چکے ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشرے میں میر و غالب اور آزاد و حالی کے متمنی ہیں تو ہمیں اپنی عظیم تہذیبی روایات سے تعلق خاطر جوڑنا ہوگا۔ اگر آپ حقیقت حال جاننے کے طلب گار ہیں اور سچ سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو جان لیجیے کہ غالب کی طرح ڈاکٹر سہیل احمد خان بھی ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے بلند قامت نمائندہ بن کر اُبھرے اور عمر بھر اپنی مٹتی ہوئی تہذیب کی کرچیاں سمیٹتے رہے۔ جس طرح مغلیہ تہذیب کا جلال و جمال

غالب کی شاعری میں محفوظ ہو گیا ہے اسی طرح اورینٹل کالج کی مشرقی تہذیبی روایات ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ جس طرح عصرِ حاضر میں غالب کا پیدا ہونا ناممکن ہے اسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد خاں جیسا استاد اور دانشور پیدا ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں خود تو دنیا سے چلے گئے مگر ان کا جلایا ہوا تہذیبی چراغ آج بھی فروزاں ہے اور ہر صاحبِ فکر و نظر کو احساس دلا رہا ہے کہ

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی علمی و عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز اورینٹل کالج لاہور جیسی بے مثال دانش گاہ سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں کا ہر استاد علم و ادب کی دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ ڈاکٹر سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر عبید اللہ خاں، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری او رخصوصاً ہر دل عزیز استاد ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اپنے اپنے فن میں یگانہ تھے۔ ان بلند قامت اور عظیم المرتبت ہستیوں کی کہکشاں میں سہیل احمد خاں جیسے نوخیز ستارے کا طلوع ہونا اور آسمان ادب پر اپنی استادانہ حیثیت کو منوانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیت اور متواتر محنت سے شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ حاصل کی۔ وہ جاہ و منصب کے طلب گار نہ تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب اس دانشگاہ پر ہوا وہوس اور حرص و آز کے سائے منڈلانے لگے تو وہ یہ کہہ کر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی روانہ ہو گئے۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ چمن ہم تو سفر کرتے ہیں

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں انہوں نے متداولہ علوم کو رائج کرنے کی مقدور بھر کوشش کی اور نصاب کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ وہ اسی "عافیت گاہ" سے سبکدوش ہوئے اور یہیں سے اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بے جاں جہاں کے کارِ مسلسل سے ہو گئے
آخر زمین اوڑھ کے تربت میں سو گئے

Death

ڈاکٹر سہیل احمد خاں زندگی بھر شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی درج ذیل کتب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

۱) ایک موسم کے پرندے (نظمیں)

۲) راہ کی نشانیاں (نظمیں)

۳) سرچشمے (تنقید)

۴) طرزیں (مضامین)

۵) داستانوں کی علامتی کائنات (تنقید)

۶) طرفین (مضامین)

۷) سیر بین (مضامین)

۸) داستان در داستان (مرتب)

۹) محرابیں (مرتب)

۱۰) رسالہ محراب (مدیر)

ہم ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی ہمہ جہت علمی و ادبی شخصیت اور فن کو درج ذیل جہتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا) استاد ب) نقاد

ج) شاعر د) مدیر

ر) دانشور س) منتظم

اب ذیل میں ان تمام جہتوں کے حوالے سے چند معروضات مختصراً پیش خدمت ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں ایک بے مثال استاد تھے۔ ان کی تدریسی صلاحیتوں کو ڈاکٹر عبادت بریلوی اور خصوصاً ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے صیقل کیا۔ ان کا طریقۂ تدریس دل نشیں، سادہ اور عام فہم تھا۔ وہ طالب علم کو ایک نئی اور تازہ دنیا میں لے جا کر چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ خود نئے زمانوں کو دریافت کرے۔ وہ اپنے اندازِ بیان کے باعث عام موضوع کو بھی خاص بنا دیتے تھے اور لیکچر کے دوران ایسے ایسے نکات بیان کرتے تھے کہ عقل حیرت زدہ رہ جاتی تھی۔ انہوں نے ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر ہزاروں طلبہ و طالبات کو قلم پکڑنا سکھایا۔ انہوں نے خود تو کم لکھا لیکن ان کے شاگردوں نے اپنے استاد کی بالیدہ فکر سے نئے نئے جہانِ معانی خلق کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ڈاکٹر سہیل احمد خان کا ایک بھی شاگرد باقی ہے ان کا نام زندہ اور فکر تابندہ رہے گی۔

”ڈاکٹر سہیل احمد خاں ایک جداگانہ طرز کے نقاد ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی داستانوں میں سے علامتی کائنات تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے علامتوں کی نوعیت اور سرچشموں کو تلاش کیا اور انہیں ایک نئی معنویت عطا کرنے کی مشکور سعی کی۔ ان کے تنقیدی مضامین عام سطح سے مختلف اور بلند ہوتے ہیں۔ حسن عسکری اور سجاد باقر رضوی کی عطا کردہ تنقیدی بصیرت کے باعث انہوں نے مغربی ادیبوں کے عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے کلاسیکی ادب کو بھی جدید تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی بلیغ سعی کی۔ انہوں نے جدید اردو ادب کے معماروں کو علوم متداولہ کی روشنی میں پرکھا اور ان کے بعض نئے گوشوں کو دریافت کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی تنقید پیشہ ور تدریسی ناقدین سے

انتہائی منفرد اور جداگانہ ہے۔ ان کی تنقید میں سوچ اور فکر کے نئے نئے زاویے اُجاگر ہوئے ہیں اور یہی طرزِ احساس ڈاکٹر سہیل احمد خاں کو ہم عصر ناقدین میں ممتاز مقام دلانے کا باعث ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں فطری شاعری تھے۔ انہوں نے ابتدائی طور پر بزمی تخلص کیا اور غزلیں سنا کر مشاعروں سے داد سمیٹی تاہم انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ غزل کی نسبت نظم ان کے مزاج سے موافقت رکھتی ہے لہٰذا انہوں نے عمر بھر اسی صنف سے اپنا ناتہ جوڑے رکھا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی نظموں میں ایک دانشورانہ سطح اُبھرتی ہے۔ وہ فطرت سے ہم کلام ہوتے ہیں اور فطرت کے تمام رنگ ان کی شاعری کا منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔ ہوا، بارش، آندھی، پھول، دریا، سمندر، پرندے، بادل، آسمان، ستارہ، گاؤں، گھاس، خزاں، بہار، شاخ، درخت، پھل اور اسی قبیل کے بے شمار الفاظ ان کی شاعری کو ایک نئی معنویت عطا کرتے ہیں اگر آپ ان کی نظموں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک جانب تو وہ اپنی کلاسیکی شعری روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسری جانب وہ شاعری کی بین الاقوامی جہتوں کو بھی سلیقے سے برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں کو سمجھنے کے لیے مشرقی شعری روایات کے ساتھ ساتھ عالمی صورتِ حال سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ ان کی معروف نظموں میں سے صرف کیمیا گر، گھاس کی انگلیاں، خواب، ظلِ سبحانی، جادوگر، کالی بارش، آئینے، بے وطن پرندہ، ہری شاخ، گمشدہ آواز، ہم زاد ستارے سے گفتگو، گمشدہ شہر، آشوب اور دروازے کا مطالعہ فرمالیجیے آپ خود محسوس کریں گے کہ ڈاکٹر سہیل احمد خان کی شاعری ایک نیا عہد اور نیا زمانہ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے ایک طویل عرصے تک رسالہ 'محراب' کی ادارت کی۔ اس زمانے میں انہوں نے معروف تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ نوآموز تخلیق

کاروں کی بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔ انھوں نے اس رسالے کے ذریعہ نئے علمی مباحث کا آغاز کیا۔ انھوں نے مقبول اور معتبر کتابوں سے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے شعوری کوشش کی کہ شعروادب کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں کو بھی متعارف کرایا جائے۔ انھوں نے بین الاقوامی ادب کے معتبر شہ پاروں کے تراجم بھی اس رسالے میں شائع کرانے کا خاص اہتمام کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی یہ مدیرانہ کاوشیں ثمر بار ہوئیں اور ان کے رسالے 'محراب' کے وسیلے سے علم وادب کو فروغ دینے والے تخلیق کار آج کل علمی وادبی دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں علم ودانش کے کوہسار تھے۔ دانش وری ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی۔ حسن عسکری اور سجاد باقر رضوی سے علمی تمسک کے باعث ان کے اندر ایسی بصیرت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ چیزوں کو دانشورانہ سطح پر جانچتے اور پرکھتے تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے بھرپور اجلاس ہوں یا علمی وادبی سیمینارز، شہر کی ادبی تقاریب ہوں یا درسگاہوں میں لیکچر سہیل احمد خاں ہر جگہ دانشورانہ سطح پر گفتگو کرتے تھے۔ موضوع کو نئے تناظر میں دیکھنا اور ان پر بے لاگ محاکمہ کرنا ڈاکٹر سہیل احمد خان کا خاصہ تھا۔ وہ نئے نئے موضوعات تلاش کرتے تھے اور ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ ان کی یہ دانشورانہ صلاحیت ان کی بے پناہ علمی قابلیت، ترقی پسندانہ فکر اور اصابت رائے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں ایک بہترین منتظم بھی تھے۔ اورینٹل کالج لاہور میں وہ شعبۂ اردو کے چیئرمین رہے اور بعد میں اسی کالج کے پرنسپل بھی بنے۔ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جائیں ان کے ماتحت ان سے خوفزدہ اور حکام بالا نالاں رہتے ہیں تاہم ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا مسئلہ بالکل مختلف رہا۔ ان کے ماتحت ان سے خوش اور حکام بالا مطمئن رہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جنازے پر

جہاں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے وائس چانسلر خالد آفتاب کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے وہاں اورینٹل کالج کے چپڑاسیوں کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ ان کا جسد خاکی دیکھ کر سب زبانِ حال سے یہی کہہ رہے تھے۔

کل جو اٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لیے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں قحط الرجال ہے اور ہر شعبۂ حیات روبہ زوال ہے۔ یہ صورتِ حال اس وقت مزید ابتر ہو جاتی ہے جب ڈاکٹر سہیل احمد خان جیسا صاحب فہم و فراست دنیا سے رخصت ہو جائے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں کو یاد کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ہم ان کی دانشورانہ روایت کی تقلید کریں اور ان کی جلائی ہوئی علمی و ادبی شمع کو اپنے خونِ جگر سے اور زیادہ فروزاں کریں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں رجائی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ وہ عالمِ بالا سے اپنے تمام محبین کو یہی پیغام دے رہے ہیں

جو ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا دوسرا ہو گا
ترے جہان میں قحط الرجال تھوڑی ہے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۱۲/اپریل ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'اساس'......۱۲/اپریل ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'جناح' لاہور......۱۴/اپریل ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'سماع' لاہور......۱۷/اپریل ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

آبروئے صحافت ۔ حمید کوثری

ایک زمانہ تھا کہ ہم پر ''مردہ پرست'' ہونے کی پھبتی کسی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ ہم زندہ تخلیق کاروں کی قدر افزائی کرنے سے گریز کرتے ہیں اور جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس کی مدح وستائش کے لیے ہم اپنے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لاتے ہیں۔ افسوس ہزار صد افسوس کہ اب ہم نے زندوں کی طرح مُردوں کو بھی فراموش کر دیا ہے۔ اب کسی نظریہ ساز اور ادب نواز تخلیق کار کی یاد میں نہ تو کوئی ریفرنس منعقد ہوتا ہے اور نہ کسی تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مرحوم تخلیق کار کی برسی کے روز اس کی قبر پر نہ تو پھول چڑھائے جاتے ہیں اور نہ چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ہماری اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟؟ کیا ہم اپنے مرنے والے ادیب دوستوں کے لیے سال میں ایک مرتبہ چند لمحات بھی نہیں نکال سکتے؟؟ ہم ادب کش معاشرے کا رونا تو روتے ہیں اور حکومت کی ادب دشمنی کی نشاندہی تو کرتے ہیں لیکن اپنی بے حسی کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ آئیے عہد کریں کہ ہم اُردو شعر وادب کے مرحوم خدمت گاروں کو یاد کریں گے اور ان کے افکار ونظریات سے اپنے چراغ فکر کو روشن کریں گے۔ اگر آج ہم نے اپنے مرحوم تخلیق کاروں کو بُھلا دیا تو ہماری آئندہ نسلیں ہمیں بھی فراموش کر دیں گی۔ میں نے یہ ترش کلمات محض اس لیے ادا کیے ہیں کہ آج مجھے آبروئے صحافت حضرت **حمید کوثری** مرحوم بے پناہ یاد آ رہے ہیں۔ ان کی علمی، ادبی اور دینی

خدمات کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی صحافت کی خدمت کرتے گزاری اور اس پرآشوب دنیا سے جاتے جاتے ''افکارِ کوثری'' کے نام سے ایک یادگار اور بے مثال دستاویز چھوڑ گئے جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

ادب اور صحافت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معروف ادیبوں نے صحافت کو با اعتبار بنانے کے لیے جو کاوشیں کی ہیں وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ عصرِ حاضر میں صورتِ حال انتہائی افسوس ناک ہے۔ ہر شخص صحافی بننے کا سودائی ہے۔ صحافت کو بچوں کا کھیل بنا دیا گیا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی اخبار طلوع ہو جاتا ہے اور خود ساختہ صحافیوں کی بات بن جاتی ہے۔ ایسے احباب جنہیں لکھنے کی مہارت ہے نہ سمجھنے کی اپنے آپ کو صحافی کے طور پر متعارف کرا کے اس مقدس پیشے کو بے وقعت کر رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقدس اور پروقار پیشے کا اعتبار بحال کیا جائے۔ اس سلسلے میں کسی حکومتی تعاون کا سوال تو بے کار ہے کہ وہ خود صحافیوں کو اپنا آلۂ کار بنانے پر مصر ہے۔ مستند اور با اعتبار صحافیوں سے التجا ہے کہ وہ نو آموز صحافیوں کو صحافت کے اسرار و رموز سے آگاہ کریں تاکہ اس پیشے کا وقار بحال ہو سکے۔ اگر ان معتبر صحافیوں نے اپنا مثبت کردار ادا نہ کیا تو آنے والا وقت ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان صحافیوں کے طرزِ عمل کو بھی اپنانا چاہیے جنہوں نے حالات کی یورش اور مال و منال کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا بلکہ حق اور سچ کا علم اٹھائے رکھا۔ ان جلیل القدر صحافیوں میں حمید کوثری بھی شامل ہیں جنہوں نے حکومت کی سختیاں تو برداشت کر لیں لیکن یزیدی قوتوں کے سامنے امام حسینؑ کے انکار کی طرح ڈٹ گئے اور ظلم و ستم ڈھانے والوں پر واضح کر دیا کہ ؎

شبیرؑ کا پیرو نہیں جو موت سے ڈر جائے
گردن نہ جھکے، شوق سے جاتا ہے تو سر جائے

پشاور ایک مردم خیز خطہ ہے۔ یہاں جملہ فنونِ لطیفہ اور خصوصاً شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد موجود رہی ہے۔ حمید کوثری کو فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور انہوں نے علم و ادب کے حوالے سے ان بزرگوں سے بے پناہ اکتساب و استفادہ کیا۔ حمید کوثری نے ایم۔ اے اُردو اور فارسی کی اسناد امتیازی حیثیت میں حاصل کیں اور صحافت کے کوچے میں قدم رکھا۔ پشاور سے پندرہ روز 'ذوالفقار' جاری کیا۔ اس جریدے نے ادب و صحافت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس جریدے میں حمید کوثری نے صحافت کو حق اور سچ سے آشنا کیا۔ انہوں نے 'ذوالفقار' میں جرأت و دیانت سے جو اداریے رقم کیے اس کی گونج دور دور سنائی دی۔ انہوں نے باطل قوتوں کے سامنے سر نہ جھکانے کا جو عزم کیا تھا اس پر مرتے دم تک قائم رہے۔ ان کے پیش نظر بنیادی طور پر یہ بات تھی کہ۔

سچ کو سچ لکھا ہے ہم نے کس لیے پچھتائیں گے
رات کو سورج کے جلوے چاند ہی کہلائیں گے

'ذوالفقار' میں ان کے مطبوعہ اداریے **'افکارِ کوثری'** کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ فہم و ذکا سے دادو تحسین حاصل کر چکے ہیں اور صحافت کے میدان میں اپنی روشنی بکھیر رہے ہیں۔

حمید کوثری کے اداریوں کو درج ذیل موضوعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱) سماجی اداریے

دہشت گردی۔ جنگ کی نئی شکل، انسانیت کا تقاضا، وقت کے اہم تقاضے، انتخابات کے بعد۔ تعمیر وطن، استعماری سازشیں اور ہمارے حکمران، ملک میں فرقہ واریت کو کون روکے گا؟، یہ غنڈہ گردی کب تلک؟

ب) شخصی اداریے

راجہ صاحب محمود آباد، قائد اعظم محمد علی جناحؒ، حضرت نجم آفندی، علامہ عدیل اختر، علامہ نجم الحسن کراروی، آیت اللہ خمینیؒ، میر خلیل الرحمٰن، سید فارغ بخاری، رضا ہمدانی، جعفر علی میر۔

ج) بین الاقوامی تناظر کے حامل اداریے

عراق پر پابندیاں، امریکی منصوبہ اور معزول وزیراعظم، ایران میں مراجع کرام پر تشدد، کفر اور اسلام کی جنگ، سعودی حکمران کا قتل

د) دینی موضوعات کے اداریے

سنی شیعہ فسادات، عشرۂ محرم میں فسادات، ملی یکجہتی کانفرنس، شریعت بل اور سینٹ، زائرین کی مشکلات و مصائب۔

درج بالا موضوعات کے حامل ان تمام اداریوں میں حمید کوثری نے شعوری کوشش کی ہے کہ اتحاد بین المسلمین کو فروغ دیا جائے اور ان قوتوں کی بیخ کنی کی جائے جو مملکتِ خداداد پاکستان میں ان دونوں قوتوں کے مابین تفرقہ پیدا کرنے کی کاوشوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے پاکستان کو درپیش چیلنجوں کا سفاکی سے تجزیہ کیا ہے اور اپنے علم، تجربے اور دانش و برہان کی روشنی میں ان سے عہدہ برا ہونے کا راستہ سمجھایا ہے۔ انہوں نے اپنے اداریوں میں ہمارے معاشرتی مسائل کو سنجیدگی سے موضوع بنایا ہے اور ان کے حل کے لیے مثبت تجاویز وضع کی ہیں۔ میرے نزدیک حمید کوثری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ایک سچے مسلمان اور پکے پاکستانی ہیں۔ وہ کسی ایسی بات کو قبول کرنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہیں جو ان کے دینی تشخص یا ملکی سلامتی کے لیے نقصان دہ ہو۔ ان کا نقطۂ نظر ہمدردانہ ہوتا ہے لیکن اس میں مصلحت پسندی کو دخل نہیں ہوتا۔ ان کا اندازِ بیان واضح اور جچا تلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت کے لیے طنز و تعریض کا سہارا بھی لیتے ہیں مگر یہ طنز ذاتی پرخاش یا

شخصی عناد کا مظہر نہیں ہوتا ہے۔ وہ منفی سماجی رویّوں اور استحصالی قوتوں کو نشانۂ ملامت بناتے ہیں۔ وہ اپنے موقف کی تائید کے لیے دانشوروں کی آرا اور شعرا کے اشعار کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے اداریوں میں ادبی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں ہم عصر اداریہ نویسوں میں ممتاز بنانے کا موجب بنتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حمید کوثری مرحوم کی صحافتی خدمات بے مثال ہیں اور ان کے اداریوں کی کتاب ''افکارِ کوثری'' ایک ایسی علمی وادبی دستاویز ہے جو ان کے نام کو زندہ، تابندہ اور پائندہ رکھے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے جلیل القدر مشاہیر کے افکار و نظریات سے بیش از بیش استفادہ کریں ورنہ حمید کوثری ہم سب سے شکوہ سنج ہوں گے کہ ۔

زمانہ آئے گا جب سب اسے سمجھیں گے اے اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۱۳ر جنوری۔ ۱۸ مئی ۲۰۰۸ء، ۱۳ر فروری ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

کمیاب

کمیاب

- ایک عہد آفرین شاعر۔ شہزاد احمد
- اردو ادب کا فرہاد۔ ڈاکٹر انور سدید
- ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا زریں انتخاب
- جدید تہذیبی اقدار کا امین۔ ڈاکٹر سعادت سعید
- پتھر کی میلی آنکھ اور رب نواز مائل
- اُجالوں کا سفیر۔ خورشید بیگ میلسوی
- عزم وہمت کا شاعر۔ اختر سعیدی
- مثبت قدروں کی حامل تخلیق کار۔ نجمہ سہیل
- ذات سے کائنات تک کا مسافر۔ جمیل صادق
- صحرائے قطر کا آہو۔ ممتاز راشد
- کنول فیروز۔ محبت اور سچائی کا علمبردار
- 'سکوت' کا شور اور نزہت عباسی

❖❖❖

◆◆◆

ایک عہد آفریں شاعر۔ شہزاد احمد

کسی بھی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے مخصوص زمانی و مکانی حدود میں رکھ کر اس کے افکار و نظریات اور ناقدانہ خیالات کا جائزہ لیں۔ ایک عظیم اور برتر شاعر کی اولین شناخت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے تہذیبی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کا بطورِ خاص اہتمام کرتا ہے اور اس زمانے میں جنم لینے والے سوالات کے تسلی بخش جوابات وضع کرتا ہے۔ اگر شاعر محض تفریحِ طبع یا دل لگی کی خاطر شاعری کرتا ہے تو اس کا تخلیقی سرمایا اسے دوام عطا کرنے کا اہل نہیں ہو پاتا اور وقت کا پہیہ اس کے افکار و نظریات کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ شعر و ادب کو محض روح پرور اور وجد آفریں تاثرات کا حامل قرار دینے والے شعرا چنگاری کی طرح جلد ہی معدوم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے عہد میں **شہزاد احمد** دوسرے شعرا سے اس لیے منفرد ہیں کہ ان کی شاعری محض حظ و مسرت بہم نہیں پہنچاتی بلکہ یہ ہمارے عہد کے اہم ترین مسائل کا حل تلاش کرتی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ترغیب دینے، مسرت بہم پہنچانے اور تزکیہ نفس کا ذریعہ بننے والی شاعری چشمِ معنی آشنا میں معتبر مقام حاصل کر لیتی ہے۔ میرے خیال میں یہ تینوں محاسن شہزاد احمد کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں تاہم نفسیاتی ژرف بینی، فلسفیانہ موشگافی، امکانی صداقتوں کا اظہار اور اسرارِ کائنات کا ادراک یہ چاروں محاسن مل کر شہزاد احمد کا شعری

منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔

شہزاد احمد ۱۶۔اپریل ۱۹۳۲ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔فلسفہ اور نفسیات میں ایم۔اے کی اسناد امتیازی حیثیت میں حاصل کیں۔کچھ عرصہ تدریس کی اور بعد میں مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہنے کے بعد روٹی کارپوریشن آف پاکستان سے جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔آج کل مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم اعلیٰ کے طور پر اپنے فرائض انتہائی تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔انہوں نے شعروادب کے تمام شعبوں کو اپنے زرّیں افکار سے سیراب کیا ہے۔فلسفہ اور نفسیات پر ان کی بے شمار کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔انہوں نے چند اہم کتابوں کے تخلیقی تراجم بھی کیے ہیں جو اردو ادب کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ان کے درج ذیل شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

۱) صدف (غزلیں)
۲) جلتی بجھتی آنکھیں (غزلیں)
۳) ادھ کھلا دریچہ (غزل،نظم)
۴) خالی آسمان (غزل،نظم)
۵) بکھر جانے کی رُت (غزل،نظم)
۶) دیوار پہ دستک (مجموعوں کا مجموعہ)
۷) ٹوٹا ہوا پل (غزل،نظم)
۸) پیشانی میں سورج (غزل،نظم)
۹) جاگن والی رات (پنجابی شاعری) ۔
۱۰) اُترے مری خاک پر ستارہ (نظمیں)
۱۱) معلوم سے آگے (نثری شاعری)

۱۲) آنے والا کل (غزلیں، نظمیں)

۱۳) ایک چراغ اور بھی (غزلیں، نظمیں)

۱۴) اندھیرا دیکھ سکتا ہے (غزل، نظم)

۱۵) کون اسے جاتا دیکھے (غزلیں، نظمیں)

۱۶) محبت جب سے وہ کرنے لگے ہیں (انتخاب، غزلیات)

۱۷) انتخاب (شاعری)

اس کے علاوہ شہزاد احمد کی شاعری کے مختلف انتخاب بھی شائع ہو کر صاحبانِ فہم و ذکا سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

شہزاد احمد ایک غیر منضبط معاشرے کے فرد ہیں۔ جب معاشرے میں انتشاری قوتیں فروغ پا رہی ہوں تو انسان آپ اپنا رہبر بن جاتا ہے۔ شہزاد احمد فلسفیانہ اور خلاقانہ ذہن کے حامل ہیں۔ وہ معاشرے کی ہر چیز کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ ان کی چشمِ بصیرت ''معلوم سے آگے'' دیکھنے کی عادی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہیں ''ٹوٹا ہوا پل'' بھی دکھائی دیتا ہے اور ان کی چشمِ بصیرت کے زور سے ''اندھیرا دیکھ سکتا ہے''۔ شہزاد احمد کی ''پیشانی میں سورج'' چمکتا ہے اور ستارہ ان کی خاک پر اترنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سورج اور ستارہ شہزاد احمد کی جھولی میں آ جاتا ہے تو ''خالی آسمان'' بھی ''ادھ کھلے دریچہ'' سے ان کی زیارت کا مشتاق نظر آتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شہزاد احمد محض اپنی شاعری کے ذریعہ اپنی ذات کو منکشف نہیں کرتے بلکہ وہ اسرارِ کائنات کو منکشف کرتے ہیں۔ ذات کو پسِ پشت ڈال کر کائنات کی دھڑکن کو وہی صاحبانِ بصیرت محسوس کر سکتے ہیں جو شہزاد احمد کی طرح غور و فکر کے عادی ہوں۔ آپ ان کی معروف نظموں میں سے صرف زمانہ ہو گیا، گردشیں اتنی زیادہ کیوں ہیں، میں ذرّہ ہوں، جسم سے باہر نکل آیا ہوں میں، گزرتی ہوئی ساعتیں، ایک سیاہ سفر،

ٹوٹا ہوا لمحہ، تکوین، ایک مفروضہ، یہ آسمان مرا ماضی ہے، ہوا زندہ ہے اور رات تنہا نکل آئی گھر سے کا مطالعہ فرما لیجیے اور دیکھیے کہ شہزاد احمد کا ذہنی کینوس کتنا وسیع اور عریض ہے نیز میرے اس سوال کا جواب بھی ضرور دیجیے کہ ہم عصر شعرا میں فکر و فلسفے کے حوالے سے شہزاد احمد کا ہم پلہ کون ہو سکتا ہے؟؟

شہزاد احمد کی شاعری اور خصوصاً غزلوں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان میں علومِ متداولہ موجزن دکھائی دیتے ہیں۔ ریاضی، فلسفہ، نفسیات، اقتصادیات اور شماریات اور ان سے متعلقہ اور ملحقہ علوم جزوی طور پر تو ہماری غزلوں کی زینت بنتے رہے ہیں لیکن شہزاد احمد وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ان سماجی علوم کو اپنی ذات میں جذب کیا اور اپنے شعری افکار کی بدولت اردو شاعری کو ایک نئی راہ دکھائی۔ انہوں نے فرائیڈ، ینگ، ایڈلر، ابراہام ماسلو، آٹو رینک، اوس پنسکی، گرڈ جیف، شوماخر، فرانسس بیکن، ولیم جیمز، ایچ جی ویلز، برٹرینڈ رسل، ٹی ایچ ہکسلے، سٹیفن جے گولڈ، جان بروز، [illegible] کارل [illegible] اور اسی قبیل کے بیسیوں مفکرین کے افکار و نظریات کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا اور اپنی شاعری میں جذب کرنے کی شعوری کاوش کی۔ آپ کو شہزاد احمد کی شاعری میں جو گہرائی اور گیرائی دکھائی دیتی ہے وہ ان کے وسعتِ مطالعہ اور ذہنی بالیدگی کی دین ہے [illegible] کے متمنی [illegible]

[illegible]

[illegible] شہزاد احمد کی شاعری [illegible] کی شاعری [illegible] عام [illegible] ان [illegible] شاعری [illegible] لطف [illegible] شہزاد احمد کی شاعری [illegible] شہزاد احمد کی

شاعری اپنا قاری خود تلاش کر لیتی ہے۔ آپ ان کی مختلف غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان میں سوچ و فکر کے کتنے زاویے جلوہ گر ہو رہے ہیں۔

میں اسے پیاس کہوں، نیند کہوں، موت کہوں
ایک لذت جو مرا پورا بدن چاہتا ہے

....

ہے نیم بے ہوش، دھند میں تیرتا ستارہ
نہ چاکِ گردوں پہ جی رہا ہے نہ مر رہا ہے

....

یہ ریت پر رینگتی لکیروں کا سلسلہ ہے
ہوا کے نقشِ قدم ہیں کیوں کر مٹائے جائیں

....

یہ لہر لہر سرکتا ہوا سراب سماں
خلا کے ہاتھ پہ منظر کہاں سے آئے ہیں

....

بس آنکھ جھپکتے ہی بدل جاتا ہے سب کچھ
اک لمحہ ٹھہرنے کی بھی مہلت نہیں ہوتی

....

مجھ کو آئینہ بنا کر اپنا اندازہ نہ کر
اے چراغِ طور حیرت سے مجھے دیکھا نہ کر

....

عہد سارے ایک لمحہ میں ہویدا کر دیے
جو بھی کچھ پیدا کیا، عہد آفریں پیدا کیا

....

میں ریزہ ریزہ ہوا نقشِ پا سلامت ہے

کوئی تو عکس پسِ آئینہ سلامت ہے

....

نہ آئے گی ہوا کو نیند کیوں کر

زمانوں کی تھکی ہاری ہوئی ہے

....

جھیل میں پھیلتے ہیں دائرے آوازوں کے

نہ سنیں کان تو آتی ہے صدا آنکھوں میں

....

جھیل کی آئینہ لہروں میں چہرہ گم ہو جاتا ہے

جیسے رستہ چلتے چلتے رستہ گم ہو جاتا ہے

....

جس قدر ہیں آوازیں نقش بنتی جاتی ہیں

جنگلوں سے بڑھ کر ہیں شہرِ بے نوا میرے

....

آپ نے درج بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کرلیا ہوگا کہ شہزاد احمد کی شاعری عام شاعری سے ذرا ہٹ کے ہے۔تاہم کسی کے ذہن میں یہ مغالطہ پیدا ہونے کا اب بھی امکان موجود ہے کہ شاید درج بالا مثالیں انتہائی تلاش وبسیار کے بعد پیش کی گئی ہیں لہٰذا اپنے موقف کو مزید واضح کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں شہزاد احمد کی صرف ایک مکمل غزل پیشِ خدمت ہے۔آپ اس غزل کا مطالعہ فرمائیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا آج کا قاری اس مزاج کی غزل کا رسیا ہے......؟؟نیز کیا آج کل کے شعرا اس مذاق ومزاج کی غزل کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں......؟؟

اِک جہانِ نامانوس کاغذوں پہ پھیلا ہے
میں قلم پکڑتا ہوں، کوئی اور لکھتا ہے
روشنی کی لہریں سی ہر طرف سے اُٹھتی ہیں
اِک چراغ لامحدود آئینے میں رکھا ہے
کتنے خالی خالی ہیں آسمان دونوں کے
تم بھی ایک دُنیا ہو دل بھی ایک دُنیا ہے
آنکھ اُٹھا کے سورج کو تُم نہ دیکھ پاؤ گے
روشنی کے اندر بھی اس قدر اندھیرا ہے
اس بدلتی دُنیا کی ایسی تیز رفتاری
پھر نظر نہ آئے گا، سامنے جو چہرہ ہے
خواب تکتے رہتے ہیں، لوگ چلتے پھرتے ہیں
اور خواب کے اندر جاگنا بھی پڑتا ہے
چین کیوں نہیں لیتی یہ نجات کی خواہش
آخر اپنی زنجیریں کون توڑ سکتا ہے
بے ثبات عالم میں کوئی بھی نہیں موجود
تُم نے کس کو چاہا تھا، تم کو کس نے چاہا ہے
آسمان کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں
اشک اور ستارے میں فاصلہ ہی کتنا ہے
کچھ سے کچھ ہوئے، منظر ایک میرے ہونے سے
وہ بھی کب نظر آیا، جو بھی مَیں نے دیکھا ہے

اپنی سرحدیں **شہزاد** توڑ کر نکل جاؤ
اپنے آپ سے اکثر بھاگنا تو ہوتا ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ایک عظیم شاعر اپنے عہد سے متاثر بھی ہوتا ہے اور نیا عہد تخلیق و تزئین کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ شہزاد احمد ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ انہوں نے متداولہ علوم سے کماحقہٗ استفادہ کیا اور اس کے خمیر سے اپنی شاعری کو زرخیز کرنے کی مقدور بھر کاوش کی۔ انہوں نے خصوصاً فلسفہ و نفسیات کے علوم کی روشنی سے اپنے شعری افکار کو منور کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی کاوش کی اور امکانی صداقتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ ایک ایسے دور میں جب ہمارا معاشرہ سطحیت کا شکار ہو چکا ہے اور شاعری میں عامیانہ جذبات کو بھونڈے انداز میں پیش کرنے کی روایت زور پکڑتی جا رہی ہے، شہزاد احمد کا دمِ غنیمت ہے کہ وہ اپنی شاعری میں فکر و فلسفے کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں تاہم وہ زیرِلب ہر صاحبِ فکر و فن سے شکوہ سنج ہیں کہ

یہ جہاں اور طریقے کا سخن چاہتا ہے
کیسے وہ بات کہوں جو مرا من چاہتا ہے

مطبوعہ
(روزنامہ دن لاہور......۲۱راپریل ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

اُردو ادب کا فرہاد۔ڈاکٹر انور سدید

کسی بھی تہذیب یافتہ معاشرے کی ایک اہم نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے تخلیق کار کی تکریم کرتا ہے اور اسے وہ تمام سہولیات فراہم کرتا ہے جو اس کی تخلیقی نشو ونما کے لیے ضروری ہوں۔ ظاہر ہے کہ تخلیق کار اگر اپنی صناعانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار نہ کرے تو معاشرہ بے آب وگیاہ میدان کی صورت اختیار کر جائے گا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک ہم نے سیاست، معیشت، مذہب، کھیل اور دیگر شعبوں کی ترقی کے لیے تو شاید کوئی منصوبہ بندی کی ہو مگر افسوس ہزار صد افسوس ہے کہ فنونِ لطیفہ اور خصوصاً شعر وادب کی ترقی و ترویج کے لیے ہم نے کبھی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ یہ بات انتہائی ملال انگیز ہے کہ کرکٹ کے میدان میں ایک چھکا لگانے والوں کے لیے تو لاکھوں روپے کے انعامات کے اعلانات کیے جاتے ہیں لیکن چھ کتابوں کے خالق کے لیے دو تحسینی الفاظ کہنے کے لیے بھی کوئی تیار نہیں ہے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرے میں کرکٹ خوب پھل پھول رہی ہے لیکن شعر وادب روبہ زوال ہے۔ اس المناک صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟ حکومت، عوام یا تخلیق کار۔ یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے۔ حکومت کی ادب میں عدم دلچسپی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اسے علم ہے کہ شعر وادب اس کے حکومتی استحکام کے لیے غیر موثر ہے۔ عوام کو شعر وادب سے زیادہ دلچسپ اور تفریحی ذرائع دستیاب ہو چکے ہیں لہٰذا انہیں کسی بھی معیار

تخلیقات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ امر انتہائی تشویش ناک ہے کہ ہمارے بعض تخلیق کاروں نے ''ادبی سودے بازی'' کے ذریعہ شعروادب کی حیثیت کو ضمنی کر دیا ہے۔ حکومتی ہر کاروں کو معلوم ہے کہ وہ بعض ادیبوں اور شاعروں کو ہم نوا کر کے اپنے مذموم مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ حکومت اور عوام الناس کی نسبت ان سطحی اور ذاتی فوائد حاصل کرنے والے خودساختہ تخلیق کاروں نے سب سے زیادہ شعروادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بدفطرت اور بدخصلت تخلیق کاروں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود شعروادب کس طرح پروان چڑھ رہا ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ان کج فہم تخلیق کاروں کے پہلو بہ پہلو بعض ایسے بلند فکر اور عالی ہمت تخلیق کار بھی موجود ہیں جو جلبِ منفعت سے دور رہ کر شعروادب کی شمع کو اپنے خونِ جگر سے فروزاں کیے ہوئے ہیں اور اس کی روشنی کو ایک لمحے کے لیے بھی مدھم نہیں ہونے دیتے۔ ان عالی مرتبت اور بلند قامت تخلیق کاروں میں **ڈاکٹر انور سدید** کا نام انتہائی روشن اور تابناک ہے۔ وہ تقریباً نصف صدی سے شعروادب کی بے لوث خدمت پر مامور ہیں اور ان کا مسلسل تخلیقی سفر آج بھی اسی آب وتاب سے جاری ہے۔ وہ ایک ماہر فنکار کی طرح اپنے ہاتھوں میں تیشۂ لفظ لیے کوہسارِ شعروادب سے جوئے معانی کھینچ کر لاتے ہیں اور خاموشی سے بنجر اذہان کو سیراب کر رہے ہیں۔ آج دنیا شعروادب کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہے اور شعروادب ڈاکٹر انور سدید کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

محمد انوار الدین المعروف بہ ڈاکٹر انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو قصبہ میانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا پاکستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مولوی امام الدین (مرحوم) انتہائی نیک سیرت اور راست باز انسان تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ابتدائی تعلیم سرگودھا میں حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اُردو میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ انہوں نے اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر وزیر آغا کی نگرانی میں اپنا معرکتہ الآرا مقالہ ''اردو

ادب کی تحریکیں'' لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ اردو ادب کے معمار ڈاکٹر انور سدید بنیادی طور پر انجینئر ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز پاکستان ڈھاکہ سے سول انجینئرنگ کی ڈگری کورس کیا اور عمر بھر محکمۂ آب پاشی سے منسلک رہے اور یہیں سے ایگزیکٹو انجینئر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اپنی انتظامی اور فنی ملازمت کے حوالے سے انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید ایک ہمہ جہت اور متنوع صفات کے حامل تخلیق کار ہیں۔ وہ ایک محقق، نقاد، کالم نگار، مدیر، مترجم اور شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے مشرق، جسارت، حریت، خبریں، پاکستان ٹائمز، قومی زبان، زندگی اور دی سٹیٹس مین میں اپنی کالم نویسی کے جوہر دکھائے اور ماہنامہ اردو زبان، ماہنامہ اوراق اور ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کی ادارت کے فرائض بڑے احسن طریقے سے ادا کیے۔ ان کے سینکڑوں مضامین مختلف علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی پچاس سے زیادہ تخلیقات زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ فہم و ذکا سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی بے شمار کتابوں کو مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کی درج ذیل اہم اور رجحان ساز کتابیں آج بھی تشنگانِ علم کو سیراب کر رہی ہیں۔

۱۔ اردو ادب کی تحریکیں

۲۔ اقبال کے کلاسیکی نقوش

۳۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش

۴۔ اردو ادب میں انشائیہ

۵۔ اردو ادب میں سفرنامہ

۶۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ

۷۔ میر انیس کی اقلیم سخن

۸۔ فکر و خیال

۹۔ اختلافات

۱۰۔ کھردرے مضامین

۱۱۔ نئے ادبی جائزے

۱۲۔ اردو افسانے کی کروٹیں

۱۳۔ اردو نظم کے اربابِ اربعہ

۱۴۔ قلم کے لوگ

۱۵۔ غالب کے نئے خطوط

۱۶۔ وزیر آغا ایک مطالعہ

۱۷۔ محترم چہرے

۱۸۔ اُردو ادب کی مختصر تاریخ

۱۹۔ ادب کہانی

ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی ہنر مندیوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر جو تحقیقی اور تنقیدی سرمایا قارئین ادب کی خدمت میں پیش کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابلِ قدر اور لائق صد تحسین ہے۔ خاص طور پر مختلف اصناف اور تحاریک کے حوالے سے ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتب استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے مختلف شخصیات کو بھی موضوع تحقیق وتنقید بنایا ہے اور ان کے بارے میں جو فیصلہ صادر فرما دیا ہے وہ لوحِ تاریخ پر ثبت ہے۔ وہ اپنے موضوع کا بغور جائزہ لیتے ہیں، اس کے محاسن و معائب پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر عمیق نگاہی سے اس کا محاکمہ کرتے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے ناقدین و محققین کی طرح ''کاتا اور لے دوڑی'' کے

اصول کو اپنانے کے روادار نہیں ہیں، یہی سبب ہے کہ ان کی تخلیقات ان کی وسعتِ مطالعہ، ژرف بینی اور گہرائی و گیرائی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ہم عصر بزرگ ناقدین کے برعکس نوجوان تخلیق کاروں کی بے حد حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ بزرگ ناقدین و محققین تو ہوا کے دوش پر رکھے ہوئے چراغ کی مانند ہیں لہٰذا اب نئے زمانے کی باگ دوڑ نوجوانوں کے ہاتھ ہی میں ہے۔ یہ بات بلا شک و بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ اردو شعر و ادب کے سینکڑوں لکھنے والوں کو ڈاکٹر انور سدید نے انگلی پکڑ کر میدانِ ادب میں چلنا سکھایا ہے اور آج بھی اس علمی آفتاب کی ضو باریاں جاری و ساری ہیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مہذب معاشرے علم و ادب کے تخلیق کاروں کی پذیرائی کرتے ہیں۔ اگر آج ہم خود کو مہذب کہلوانے کے متمنی ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم ڈاکٹر انور سدید جیسے نابغۂ روزگار تخلیق کار کی پذیرائی کریں تاکہ وہ خوش دلی اور دل جمعی کے ساتھ جوئے ادب سے جوئے معانی نکال کر قارئین کی فکر و نظر کی سیرابی کا سامان فراہم کرتے رہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علم دوست شخصیت کا سایہ ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے اور ہم جناب محسن فارابی کے الفاظ میں انہیں خراجِ تحسین پیش کر سکیں کہ

کوہساروں میں رواں کرتا ہے وہ جوئے ادب
کشورِ اُردو کا اک فرہاد ہے انور سدید

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور...... یکم فروری ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور...... ۱۴ نومبر ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

◆◆◆

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا زرّیں انتخاب

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انسانی معاشرے کی تخلیقی قوتوں کا اظہار سب سے زیادہ شعروادب میں ہوتا ہے۔ ایک تخلیق کار جس معاشرے میں جنم لیتا ہے اس کے تمام منفی و مثبت اثرات اس پر مرتسم ہوتے ہیں۔ ایک خاص زمان و مکان میں مقید ہونے کے باعث اس کی ذہنی صلاحیتوں کی تشکیل و تہذیب میں وہاں کے واقعات و سانحات خاص طور پر اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ وہ ادب کی حقیقی تفہیم کے لیے کسی بھی معاشرے کے تہذیبی و تاریخی عوامل سے آگاہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ ادب اور تاریخ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ ادب کسی قوم کی داخلی کیفیات اور طرزِ احساس کا مظہر ہوتا ہے جبکہ تاریخ اس کے باطنی عوامل کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ میرے خیال میں ادبی تاریخ کی تشکیل اور شعروادب کا عہد بہ عہد انتخاب معاشرے کے تہذیبی رویوں کو محفوظ کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

اردو میں ادبی تاریخ لکھنے کا آغاز تو مولانا محمد حسین آزاد نے کیا لیکن سطحی معلومات اور غیر مصدقہ نتائج کے باعث ''آبِ حیات' کا بھرم اپنے سحر انگیز اسلوب کے باوجود زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اردو کے بے شمار ناقدین اور محققین نے اردو ادب کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی مگر غیر سائنٹفک طریقۂ کار اور شماریاتی رویوں سے بے

خبری کے باعث ان کی تاریخیں تاریخ کا حصہ تو بن گئیں لیکن اپنے اثرات مرتب نہ کر سکیں۔محمد حسین آزاد سے لے کر ڈاکٹر تبسم کاشمیری تک ہر ادبی تاریخ نویس نے اپنی پسند و ناپسند کو اہمیت دی اور تاریخ کو اپنے مزاج، معیار اور مذاق کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔یہی سبب ہے کہ ہم کسی ادبی تاریخ کو عالمی معیار کے مطابق نہیں پاتے ہیں اور ادبی تاریخ کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے ہم ''اُردو ادب کی حقیقی تاریخ'' قرار دے سکیں۔اسی طرح شعری انتخاب کی کوئی مستند روایت ہمارے ادب میں موجود ہی نہیں ہے۔مختلف عہد میں لکھے گئے تذکروں اور تاریخوں میں نمائندہ شعرا کے منتخب اشعار تو موجود ہیں لیکن ان میں تذکرہ نگار کی پسند و ناپسند کو خاص دخل رہا ہے اور اسی باعث انہیں شعری انتخاب قرار دینا ادبی بددیانتی ہے۔

ہمارے نزدیک شاعری کا انتخاب مرتب کرنے والے محقق، مورخ اور ناقد کو درج ذیل باتوں کا بطور خاص خیال رکھنا چاہیے۔

(۱) شعری انتخاب بغیر کسی نسلی علاقائی، مذہبی اور لسانی تعصب کے ترتیب دینا چاہیے۔

(۲) دستیاب مواد کو اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھ لینا چاہیے تاکہ اس میں کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

(۳) جدید دور کی ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(۴) شاعری کا انتخاب کرتے ہوئے ہر شاعر کے نمائندہ کلام کو پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے۔ اگر کسی شاعر کا محض کمزور کلام منتخب کر دیا جائے تو اس کا مرتبہ کم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

(۵) شعرا کے الحاقی کلام کی پیش کش سے گریز کرنا چاہیے۔محض حافظے کی بنیاد پر اشعار کی پیش کش سے مغالطے پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

(۶) متن کی اغلاط سے بچنے کے لیے شعرا کے دواوین سے براہِ راست انتخاب کرنا

چاہیے۔

(۷) اگر شاعروں کی ایک سے زیادہ تخلیقات پیش کی جا رہی ہیں تو یکسانیت سے پرہیز کرتے ہوئے مختلف مذاق اور مزاج کی تخلیقات پیش کرنا چاہئیں۔

(۸) شعری انتخاب کرتے ہوئے حروف تہجی کو بنیاد بنانے کے بجائے شاعر کے سنِ ولادت کو بنیاد بنانا بہتر ہے۔ اس طرح یہ انتخاب ہماری شعری تاریخ بھی بن جائے گا۔

(۹) شاعری کا انتخاب کرتے ہوئے اعلیٰ شعری ذوق کا مظاہرہ کرنا چاہیے ورنہ یہ انتخاب کم حیثیت ہو جائے گا۔

(۱۰) جس شاعر کے کلام کا انتخاب کیا جائے اس کا سنِ ولادت و وفات، اہم کوائف اور شعری مجموعوں کا ذکر ضرور کر دیا جائے تاکہ شاعر کے بارے میں بنیادی معلومات دستیاب ہو جائیں۔

(۱۱) شعرا کے منتخب کلام کی پروف خوانی میں احتیاط ضرور کی جائے تاکہ درست متن قارئین تک پہنچ سکے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ عصرِ حاضر کے شماریاتی اور سائنسی طریقۂ کار کو بنیاد بنا کر اردو شاعری کا ایک مستند اور معیاری شعری انتخاب مرتب کیا جائے جو ہمارے گزشتہ عہد کی خامیوں سے مبرا ہو اور اس میں حق و صداقت کی ایسی روشنی موجود ہو جو آنے والے قارئین کے لئے باعث طمانیت ہو۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا** نے اردو شاعری کے باسلیقہ انتخاب کا بیڑا اٹھایا ہے اور انہوں نے انتخاب زریں کے عنوان سے اُردو غزل اور اُردو نظم کا انتخاب کر کے عہدِ حاضر کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے اور یہ سلسلہ بڑی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔

اس بھاگ دوڑ کی دنیا میں ایسے افراد کی تعداد انتہائی قلیل ہے جنھوں نے اپنی زندگی علم وادب کے فروغ کے لیے صرف کر دی اور ان کی جد وجہد اور مسلسل کاوشوں کے باعث ایک ایسی نسل وجود میں آ گئی جو علم وادب کی پرستار ہے۔ ان چنیدہ لوگوں میں ایک بلند ہمت اور جلیل القدر ہستی **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا** کی بھی ہے جن کی محنت شاقہ کی بدولت نوجوان نسل، علم وادب کی طلب گار ہوئی اور آج ان کے ہزاروں طالب علم اپنے استاد کے عطا کردہ فیوض وبرکات کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ۱۹۴۰ء میں امرتسر بھارت میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے آنرز کیا اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے اردو کی سند (اول بدرجہ اوّل) حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ''اکبرالہ آبادی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پیکنگ یونیورسٹی بیجنگ چین، ایچی سن کالج لاہور وغیرہ میں چالیس برس تک تدریسی فرائض بحسن وخوبی ادا فرماتے رہے اور اب یہ بات بلاشک وبلاتردد کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے طلبہ وطالبات دنیا کے ہر گوشے میں اردو زبان وادب کے تحفظ اور فروغ کے لیے ہمہ تن مصروف ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی درج ذیل تصنیفات وتالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

(۱) قدیم اصناف شعر (۲) اُردو میں قطعہ نگاری

(۳) اکبرالہ آبادی — تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

(۴) تفہیم بالِ جبریل (۵) نئے پرانے خیالات

(۶) اقبالیات — چند نئی جہات (۷) چند اہم جدید شاعر

(۸) Urdu for Beginners (۹) کلیاتِ مجید امجد (تدوین)

(۱۰) کلیاتِ حفیظ جالندھری (تدوین) (۱۱) پریم چند کے بہترین افسانے
(۱۲) انتخاب مجید امجد (۱۳) نثرِ اکبرالہ آبادی (تدوین)
(۱۴) انتخاب زرّیں (اردو نظم) (۱۵) انتخاب زرّیں (اردو غزل)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اردو کے کلاسیکی شعروادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی کی سطح پر بطورِ خاص وہ کلاسیکی شاعری کی تدریس کا وسیع تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے انتخاب زرّیں کے عنوان سے اُردو غزل اور اُردو نظم کا معیاری اور مستند انتخاب پیش کیا ہے جسے سنگت پبلشرز لاہور نے بڑے سلیقے اور اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اردو غزل کے انتخاب میں قلی قطب شاہ سے لے کر پروین شاکر تک دو سو شعرا کی معروف و مقبول غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ اٹھارہ صفحات پر مشتمل مقدمہ میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اردو غزل کی عہد بہ عہد تاریخ پر مختصراً مگر مبسوط گفتگو کی ہے اور آخر میں اس کتاب کے بارے میں اپنے معروضات پیش کیے ہیں۔ آخر میں ایک اشاریہ بھی دے دیا گیا ہے جس کی مدد سے شعرا کے کلام کو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ''انتخاب زرّیں اردو غزل'' تین سو چوراسی صفحات کو محیط ہے اور صوری اور معنوی ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور لائق صد تحسین ہے۔

''انتخاب زرّیں اردو نظم'' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی ایک اور نادر تالیف ہے جس میں انہوں نے محمد قلی قطب شاہ سے لے کر شبیر شاہد تک ایک سو دس نظم نگار شعرا کی منظومات کا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں دس صفحات پر مشتمل دیباچہ میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اردو نظم کی مختصر تاریخ بیان کی ہے اور اس انتخاب پر روشنی ڈالی ہے۔ تین سو باون صفحات پر مشتمل یہ انتخاب صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے قابلِ قدر اور لائق ستائش ہے۔

یہ دونوں مجموعے اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی وقیع اور قابلِ قدر ہیں۔ ان مجموعوں میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے غزل اور نظم دونوں کا کڑا انتخاب کیا ہے جو ان کی اصابت

رائے، ذہانت اور فطری صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کتب کے سرسری مطالعہ کے بعد راقم الحروف کو جو محاسن نمایاں نظر آئے انہیں نکات کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) یہ انتخاب ایک ایسے محقق اور نقاد نے کیا ہے جو شعری ذوق بھی رکھتا ہے اور خود بھی شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کرتا رہا ہے۔

(۲) اس انتخاب میں محض معروف اور مقبول شعرا ہی کو جگہ نہیں دی گئی ہے بلکہ ان مستند شعرا کا کلام بھی پیش کیا گیا ہے جو کسی بھی سبب مشہور نہ ہو سکے۔

(۳) اس انتخاب میں ان شعرا کو بھی شامل کیا گیا ہے جو معروف ادبی مراکز سے دور رہ کر نظم وغزل کی آبیاری میں مصروف ہیں۔

(۴) مختلف شاعروں کی نمائندہ غزلیں اور نظمیں اس انتخاب کی زینت ہیں یہی سبب ہے کہ یہ مجموعہ متنوع اور رنگا رنگ ہو گیا ہے۔

(۵) اس مجموعے میں شعرا کا انتخاب کرتے ہوئے کسی بھی قسم کا تعصب نہیں برتا گیا ہے بلکہ ہر شاعر میرٹ پر منتخب ہوا ہے۔

(۶) کسی بھی شاعر کے مشہور کلام کی نسبت فنی طور پر مستحکم کلام کو منتخب کیا گیا ہے اور فنی طور پر کمزور کلام سے عمداً صرف نظر کیا گیا ہے۔

(۷) معروف اور مستند شعرا کے کلام کو منتخب کرتے ہوئے ان کی ایک سے زیادہ تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔

(۸) مشکل اور دقیق کلام کے انتخاب سے گریز کیا گیا ہے۔

(۹) شاعروں کے ناموں کو بالعموم زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ مجموعے اردو نظم اور غزل کی تاریخ بھی مرتب کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱۰) ان مجموعوں میں مرحوم شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے کہ ان کا شعری سفر مکمل ہو چکا ہے

یاان زندہ شعرا کا کلام منتخب کیا گیا ہے جن کی عمر پچھتر سال یا اس سے تجاوز کر چکی ہے۔

(۱۱) ان مجموعوں میں شاعروں کے بارے میں مختصراً کوائف بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح قاری ہر شاعر کے بارے میں ابتدائی معلومات سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

(۱۲) اردو غزل کے انتخاب میں غزل گو شعرا کی غزلوں کے بعد ان کے معروف و مقبول اشعار بھی پیش کر دیے گئے ہیں تا کہ قارئین ان سے بیش از بیش لطف اندوز ہو سکیں۔

(۱۳) ان مجموعوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ تمام شعرا کی غزلوں اور نظموں کا درست متن ہمارے سامنے آ رہا ہے۔

(۱۴) اس انتخاب کے ذریعہ پاکستان کے تمام صوبوں کے نامور شعرا سے قارئین کماحقہٗ آگاہ ہو سکتے ہیں اور اس طرح یہ مجموعے باہمی یگانگت کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔

(۱۵) ان مجموعوں کا ذریعہ ادبی اور شعری ترقی کی رفتار سے بھی بخوبی آگاہ ہوا جا سکتا ہے۔

(۱۶) ان مجموعوں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے مطالعہ سے عام قاری بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے اور اسے اردو غزل اور نظم کے مطالعہ سے دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱۷) غزلیہ انتخاب کے آخر میں شعرا کی فہرست بھی حروف تہجی کے اعتبار سے وضع کر دی گئی ہے تا کہ کسی بھی شاعر کے کلام کو تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

اس گئے گزرے زمانے میں جب شعر و ادب سے تعلق جگ ہنسائی کا موجب ہو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا سخت محنت اور ریاضت سے شعر و ادب کی ترویج کے لیے اس مزاج کے انتخاب مرتب کرنا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ ہماری استدعا ہے کہ وہ اردو غزل اور نظم کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف مثلاً قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، سلام وغیرہ کے انتخاب بھی مرتب

کر دیں تا کہ اس ادب کش معاشرے میں شعروادب کے لیے رغبت کے سامان مہیا ہو سکیں۔ ہمیں علم ہے کہ اس آلکسی اور کاہلی کے دور میں صرف ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہی یہ مشکل ترین فریضہ ادا کر سکتے ہیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ تخلیقی قوتوں کا سب سے زیادہ اظہار شعروادب میں ہوتا ہے لہٰذا معاشرتی رُخوں کو محفوظ کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ ہم شعروادب کی ترقی وفروغ کے لیے اپنی ممکنہ صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ادبی تاریخ اور شعروادب کا عہد بہ عہد انتخاب ہماری جلالی اور جمالی تہذیب کو محفوظ کرنے کا سب سے بڑا اور موئثر ذریعہ ہے۔ یہ امر انتہائی مسرت انگیز ہے کہ معروف نقاد، مستند محقق، مقبول دانشور اور بے مثال استاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اردو شاعری کی مختلف اصناف کے زرّیں انتخاب کا لاجواب سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اردو نظم اور غزل کے حوالے سے ان کی مطبوعہ کتب کو دیکھ کر ان کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کی داد دینا پڑتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اسی محنت، جاں فشانی اور جدوجہد کے ساتھ اس منصوبے کو جاری رکھیں گے۔ بقول جعفر طاہر؂

ڈھل جائے گی درد کی کٹھن رات
اُبھرے گا نہ آفتاب کب تک

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن'...... یکم جنوری ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور...... ۱۶، ۱۹۔ جنوری، ۷ فروری، ۲۰ فروری ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

جدید تہذیبی اقدار کا امین۔ڈاکٹر سعادت سعید

عصرِ حاضر میں ہماری زندگی سے لطف وانبساط کے ختم ہو جانے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی سوسائٹی سے فنونِ لطیفہ کو بے وقعت کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لطف فراہم کرنے والے عناصر سوسائٹی سے یکسر معدوم ہو جائیں گے تو غم والم پیدا کرنے والے عناصر کو پنپنے کا موقع مل جائیگا۔ شعروادب محض حظ ومسرت تخلیق کرنے کا باعث ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ ترغیب اور درس دینے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سخت گیر **افلاطون** نے بھی اپنی مثالی ریاست میں مذہبی اور اخلاقی شاعری کی گنجائش رکھی تھی۔ آج کے متعصب دور میں خودساختہ مذہبی لبادہ اوڑھنے والی قوتوں نے فنی وجمالیاتی اقدار سے لاتعلق ہو کر سخت گیر اخلاقیات کے بہانے فنون لطیفہ کے تمام بتوں کو گرانے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ طرزِ احساس انتہائی پست ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرے کو تہذیب وثقافت کا علمبردار بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں جملہ فنونِ لطیفہ کا احترام کرنا چاہیے اور یہ نکتہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ عظیم تہذیبیں مذہب سے نہیں ثقافت سے پہچانی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان تخلیق کاروں کو بھی اہمیت دینا چاہیے جو دنیاوی دولت وثروت کو چھوڑ کر اپنی تہذیب وثقافت کو محفوظ کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔ انہیں نہ تو ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ وہ صلے کی پرواہ کرتے ہیں۔ پاکستانی

تہذیب وثقافت کو اپنی تحریروں میں محفوظ کرنے والے عمائدین میں ایک اہم نام **ڈاکٹر سعادت سعید** کا بھی ہے جنہوں اپنی ساری زندگی شعروادب کی تفہیم اور ترویج کے لیے وقف کردی اور یہ مستحسن سلسلہ آج بھی اسی زوروشور سے جاری وساری ہے۔

ڈاکٹر سعادت حسن سعید ۱۵/مارچ ۱۹۴۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد استاد الاساتذہ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم ہوشیار پور کے ایک تجارتی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے تجارت ترک کر کے تدریس کا پیشہ اپنایا اور اپنے علمی تبحر اور فلسفیانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ''اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر'' کے موضوع پر بے مثال تحقیقی وتنقیدی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور عمر بھر تشنگانِ علم وادب کی پیاس بجھاتے رہے۔ ان کی رحلت کے بعد بھی ان کا یہ علمی اور تخلیقی سفر ان کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر سعادت سعید کے توسط سے آج بھی جاری و ساری ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی۔ اے کیا اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے اردو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کالج میں اُس وقت ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر عبیداللہ خان، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار جیسے عالی قدر اور بلند مرتبت اساتذۂ کرام اپنی علمی وادبی فیاضی کے گوہر نچھاور کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے ایم۔ اے میں ''اُردو نظم میں جدیدیت کی تحریک اور اس کے علمبردار'' اور پی ایچ۔ ڈی میں ''اردو قصیدے کا تہذیبی اور فنی مطالعہ'' کے موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھ کر اپنی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے پنجاب کے مختلف کالجوں میں تدریس کے جوہر دکھائے۔ وہ پانچ برس تک انقرہ یونیورسٹی میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تاہم ان کی عمر کا کثیر حصہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں بسر

ہوا اور وہ آج کل بھی صدر شعبۂ اردو کی حیثیت میں اسی عظیم درسگاہ سے وابستہ ہیں اور ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کے سکالروں کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔ڈاکٹر سعادت سعید کی درج ذیل اہم کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں:

- جہت نمائی (تنقید)
- فن اور خالق (تحقیق وتنقید)
- ادب اور نفی ادب (تنقید)
- اقبال ایک ثقافتی تناظر (تحقیق)
- اقبال اور مجلۂ ساہیوال (تحقیق وتدوین)
- تہذیب، جدیدیت اور ہم (ترجمہ)
- مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق (اردو نثری ترجمہ)
- ابنِ عربی اور مسلۂ وحدت الوجود (ترتیب وتدوین)
- چاند وقت (ترجمہ)
- کجلی بند (نظمیں)
- فنون آشوب (طویل نظم)
- بانسری چُپ ہے (شاعری)
- شناخت (شاعری)

ڈاکٹر سعادت سعید ایک ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کے مالک ہیں۔وہ بیک وقت محقق، نقاد، شاعر، ماہر تعلیم، مدرس، مترجم، کالم نگار، ادیب اور بہترین منتظم ہیں۔اس مختصر سے شذرے میں ان کی تمام جہتوں کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں ہے تاہم سرِ دست ان کی شاعری اور تنقید کے حوالے سے چند اہم نکات پیشِ خدمت ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے مروجہ تنقیدی

معیارات کو تبدیل کرنا ہوگا۔ ہم غالب کی تاسی میں اعلیٰ شعری افکار کو غیبی قوتوں کی عطا سمجھتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید ایڈگر ایلن پو کی طرح فن کار میں کسی غیر شعوری یا وجدانی تحریک شعر کے قائل نہیں ہیں۔ وہ فن پارے کو فنکار کی شعوری کاوش کا نتیجہ سمجھتے ہیں تاہم ان کا موقف یہ ہے کہ آسمانی دانش کو حاصل کرنے کے بعد اسے زمین والوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ وہ ''شعر گوئی'' کے بجائے شعر سازی کے قائل ہیں۔ وہ تخلیق کار کو کسی الہامی یا جنونی کیفیت میں مبتلا کرنے کے بجائے اسے فکری اور فنی ہر دو لحاظ سے ''خود مختار'' دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر سعادت سعید وہ منفرد شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کے رشتے آسمان سے توڑ کر زمین سے جوڑ دیے ہیں۔ شاعری کو زمینی حقائق سے منسلک کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر زمینی صورتِ حال سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری میں آسمانی کہکشاؤں سے زیادہ زمینی حقائق سے تعلقِ خاطر ملتا ہے۔ اگر آپ ان کی نظموں کا بغور مطالعہ فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں ارضی قربت اور فرقت کے کئی زاویے دکھائی دیں گے۔ آپ ان کی نظمیں زندگی کا جام پہیہ، عقائد پرست، نارسائی، ذہن کے کینوس، خیاط دہشت، خواہش کی معصومی، افتاد، شکست اور لوگ کہتے ہیں کہ وغیرہ کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ڈاکٹر سعادت سعید کس طرح زمینی حقائق کو شعری پیرائے میں اجاگر کراتے ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ناصر کاظمی کی طرح نہ تو ماضی پرست ہیں اور نہ اپنے قارئین کو ماضی کے حسین دھندلکوں میں جکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید ماضی کے عظیم تاریخی ورثہ کے مخالف نہیں ہیں تاہم ان کے نزدیک بڑی شاعری میں عصری حسیت کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک شاعر جس صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے اس کی تصویر کشی

کرتا ہے۔ یہ بات ناممکن ہے کہ عصرِ حاضر کا کوئی بھی شاعر قرونِ وسطیٰ کی صورتِ حال کو اپنے شعر میں محفوظ کرنے کی کوشش کرے۔ آپ ان کی نظم ''ماضی سے ہمیں لینا کیا ہے'' اور اسی قبیل کی دوسری نظموں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ ماضی اور دیگر زمانوں کے بارے میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری میں فکر و فلسفہ بھی ہے اور درس و ترغیب بھی۔ ان کے نزدیک شعر و ادب کا بنیادی مقصد آدمی کو انسان بنانا ہے۔ جب کوئی آدمی آدمیت کے چھوٹے دائرے سے نکل کر انسانیت کے بہت بڑے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ اب اس کی زندگی کے سطحی مقاصد ارفع ہو جاتے ہیں۔ اب وہ انسان دوست، حق کا علمبردار، صداقت کا متوالا، مساوات کا طلب گار، انسانی آزادی و وقار کا رسیا اور کذب و ریا، دہشت گردی اور ضمیر فروشی کا دشمن بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنی شاعری میں اردو شعری روایت سے ہٹ کر ایک نیا طرزِ حیات مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔ اس نظام کی ترتیب میں انہوں نے مشرق و مغرب کے تمام معروف شاعروں، فلسفیوں اور دانش وروں سے فکری اکتساب کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر سعادت سعید کی شاعری ہمیں فوری طور پر احمد فراز یا ناصر کاظمی کی طرح حظ و مسرت تو فراہم نہیں کرتی لیکن وہ اپنے قاری کو ایک ایسے نامعلوم جہان میں لے جاتی ہے جہاں جا کر ایک تحیر اور استعجاب کی ایک ایسی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے جس کا بیان الفاظ میں ممکن ہی نہیں ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید کی ایک اہم جہت ان کی فنِ تنقید سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ ان کے سینکڑوں مضامین و مقالات زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے نظری اور عملی ہر دو سطح پر صنفِ تنقید کی آبیاری کی۔ انہوں نے ایک جانب تو افتخار جالب، جیلانی کامران، کشور ناہید، زاہد

ڈار، آفتاب اقبال عظیم، جاوید شاہین، افضال احمد سید، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب، اختر حسین جعفری، ظہور نظر، میرا جی، خالدہ حسین، شہزاد احمد، صدیق کلیم، اسرار زیدی، امجد اسلام امجد، انتظار حسین، ن م راشد، ناصر کاظمی، اشفاق احمد، منٹو، فیض، فراق، خدیجہ مستور، مشتاق یوسفی، سیف زلفی اور حیدر قریشی جیسے ہم عصر تخلیق کاروں کے فن پر بے لاگ تبصرہ کیا اور دوسری جانب محمد حسین آزاد، حفیظ جالندھری، غالب، ذوق، اقبال وغیرہ جیسے کلاسیکی تخلیق کاروں کے فن پر کماحقہٗ روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح انہوں نے بے شمار نظری موضوعات پر قلم فرسائی فرما کر قارئین کے لیے علم و دانش اور فکر و ادراک کے نئے نئے در وا کر دیے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سعادت سعید کا تنقیدی ایوان کن ستونوں پر استوار ہے؟؟ میرے خیال میں ڈاکٹر سعادت سعید کی تنقید درج ذیل ستونوں پر استوار ہے:

(ا) مشرقی تہذیب و ثقافت سے دلچسپی

(ب) علوم متداولہ سے انسلاک

(ج) ترقی پسندانہ طرزِ احساس

(د) وجودی طرزِ حیات

(ر) ہم عصر بین الاقوامی صورت حال سے روابط

(س) دانش مندانہ روشن خیالی کی روایت

ڈاکٹر سعادت سعید تنقید میں واضح نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ وہ جدید تنقیدی روایات سے منسلک ہیں اور عصری تحاریک ان کے پیش نظر ہیں تاہم ان کا موقف یہ ہے کہ تنقید میں جدیدیت و مابعد جدیدیت، ساختیات و پس ساختیات، تحلیلِ نفسی، نو آبادی نفسیات، منطقی اثباتیت، تاریخیت، نسائیت یا تانیثیت کے نام پر ناقدین نے اپنی علیحدہ علیحدہ دکانیں سجا رکھی ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کا طریقۂ تنقید یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے

موضوع کے تمام رُخوں کا کماحقہ مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنا ایک نقطۂ نظر وضع کرتے ہیں۔ اپنے موقف کو اُجاگر کرنے کے لیے وہ آغاز ہی میں ایک تمہید بناتے ہیں اور اسی نظریے پر موضوع کے جملہ پہلوؤں کو جدید تنقید کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہے لہٰذا وہ اُفقی اور عمودی دونوں سطحوں پر اپنے موقف کی تائید کے لیے مشرق و مغرب کے تمام اہم ناقدین کے نظریات سے استفادہ بھی کرتے ہیں اور انہیں بطور استدلال پیش بھی کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ڈاکٹر سعادت سعید کی تنقید کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ''نظریہ ساز'' ہیں۔ اگر آپ انکے تمام نظری مضامین کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمالیجیے تو آپ ان نظریات کی روشنی میں ایک نیا تنقیدی دبستان وضع کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ انہوں نے پیش پا افتادہ، غیر مستند ادبی نظریات کو مسترد کر کے ہم عصر ادبی صورت حال کے مطابق نظریات وضع کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ آنے والے زمانے میں ادب و شعر کو انسان دوستی اور بھائی چارے کے لیے استعمال کیا جائے گا کیونکہ علم و شعور کے تمام ذخائر جمالیاتی قدروں کے وسیلے ہی سے قارئین کے شعور و وجدان کا حصہ بنیں گے۔ اردو میں علی عباس جلالپوری نے اپنی تنقید میں قدیم تہذیبی روایات کو نئی صورتِ حال پر منطبق کرنے کی مشکور سعی کی تھی اور پروفیسر حسن عسکری نے فرانسیسی اور یورپی تنقیدی تصورات کو مشرق کی مابعدالطبیعیاتی روایات سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں ناقدین کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تنقیدی روایات کو مشرقی تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ درج بالا دونوں معتبر ناقدین کے افکار و نظریات کا حسین امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر سعادت سعید کی تنقید کا مطالعہ فرمالیجیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر سعادت سعید اپنی بے پناہ علمی صلاحیت، وسیع مطالعہ، تنقیدی بصیرت اور منفرد جارحانہ اسلوب کے باعث

اردو تنقید میں ایک بلند، معتبر اور ممتاز مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہمیں فنونِ لطیفہ کے تحفظ اور فروغ کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنا چاہیے اور ان احباب کی پذیرائی کرنا چاہیے جو اپنے خونِ جگر سے فنونِ لطیفہ تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ موروثی طور پر علم و دانش کی ایک عظیم تہذیبی روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے افکار و نظریات سے اردو شعر و تنقید میں نئے نئے رُخ اُجاگر کیے ہیں اور نئے نئے مضامین کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کی شخصیت اور فن کی مختلف جہتوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ کیا ایک فرد اتنے بڑے بڑے کام تنہا انجام دے سکتا ہے......؟؟؟ ڈاکٹر سعادت سعید آج بھی انیس کی زبان میں علم و ادب کے پرستاروں کو دعوت دے رہے ہیں کہ

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۴ جون ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

''پتھر کی میلی آنکھ'' اور رب نواز مائل

اس فنا پذیر دنیا میں بھی ہر انسان شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ بنانے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس بلند اقبالی کے حصول کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز حربہ اختیار کرنے کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ خاص طور پر عصرِ حاضر میں سستی شہرت کے حصول کے لیے ہر انسان جس طرح پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو استعمال کر رہا ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے شہرت اور رسوائی کے مابین باریک فرق کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ شہرت کے خواہشمند رسوائی کے دریا میں غرق ہو جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا ہے۔ اس فانی دنیا میں کچھ ایسے باشعور افراد بھی موجود ہیں جو شہرت کو ٹھکرا کر محنت کا دامن تھام لیتے ہیں۔ ان کی یہی متواتر محنتِ شاقہ اور بے لوث لگن انہیں شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلوانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ پست ہمتی دنیا میں انسان کو ذلیل و رسوا کرنے کا موجب بنتی ہے جبکہ دستِ ہمت سے آدمی کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے اور وہ شخص سے شخصیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گویا کام، کام اور کام ہی انسان کو معاشرے میں بلند مرتبہ عطا کرتا ہے۔ بقول رب نواز مائل۔

کہ انصاف ہو تو یہی پھر کہیں ہم
فقط کام ہی سے تشخص بڑا ہے

اپنی زندگی میں صرف اور صرف ہمت کو مشعلِ راہ بنانے والوں میں ایک اہم اور معتبر نام **رب نواز مائل** کا بھی ہے۔ انہوں نے عمر بھر سستی شہرت کے حصول سے گریز کیا اور یہی سبب ہے کہ اپنی ریاضتوں اور قارئین کی دعاؤں کی بدولت آج وہ خورشیدِ سخن بن کر آسمانِ ادب پر جگمگا رہے ہیں۔

یہ جس سے فن ہمارا معتبر رہے
ریاضتوں اور دعاؤں کا اثر ہے

رب نواز مائل ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو شہر لورالائی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد بہادر نواز ایک نیک، مخلص، علم پرست، دیندار اور صلح پسند انسان تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے بہترین تعلیم کا اہتمام کیا اور رب نواز مائل کو دینی اور دنیوی تعلیم سے مستفید ہونے کے وافر مواقع فراہم کیے اور رب نواز مائل نے بھی اپنے والدین کی خواہشات کی تکمیل کی خاطر ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ حصولِ روزگار کے لیے انہوں نے ادھر اُدھر بے شمار ملازمتیں اختیار کیں تاہم علم سے دلبستگی کے باعث انہوں نے تدریس کے پیشے کو اپنایا اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہو کر آج کل شعر و ادب کی خدمت پر مامور ہیں اور اپنے روغنِ دماغ سے شعر و ادب کے ایوان کو جگمگا رہے ہیں۔

ہو وہی مجھ سے ادب جو بڑا ہو بہت
فن میں معنی سے بھی کام کا ہو بہت

رب نواز مائل شعر و ادب سے والہانہ رغبت رکھتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی میں مضامین لکھا کرتے تھے اور اپنے اساتذہ کی نگاہوں کا تارا تھے۔ جب لورالائی کالج میں استاد بنے تو ''رنگ سنگ'' کے عنوان سے سالانہ جریدے شائع کیے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں علم و ادب کی شمع روشن کرنے کے لیے کئی علمی و ادبی تنظیمیں

بھی قائم کیں۔ ان اداروں نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ لوحِ تاریخ پر آج بھی جگمگا رہے ہیں۔ پاکستان کے تمام معروف رسالوں 'اوراق'، 'فنون'، 'ماہِ نو'، 'ادبِ لطیف'، 'شام وسحر' اور 'صریر' وغیرہ میں رب نواز مائل کی نثری و شعری تخلیقات نہایت آب و تاب سے شائع ہوئیں اور یہ سلسلہ بحمد اللہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

رب نواز مائل کی غزلوں کا اولین مجموعہ ''پتھر کی میلی آنکھ'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ سکام ادبی اکیڈمی کوئٹہ نے اس مجموعے کو بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ رب نواز مائل نے اس مجموعے کے آغاز میں انتہائی فلسفیانہ سطح پر ایک بات اپنے قارئین کی خدمت میں گوش گزار کی ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

> ''ہم سب انسان زندگی میں فراخی کے تمنائی ہیں اسی لئے جب صبحوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم راتوں کی تمنا کرتے ہیں اور جب راتوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم صبحوں کی تمنا کرتے ہیں۔ گویا یہاں قید ہی قید ہے ہمارے زیادہ تر مادی صورتوں میں گزر بسر کی وجہ سے اور اسی تعلق سے یہ جو ہمارا خیال ہوتا ہے کہ دولت مند لوگ خوش سی آزادسی زندگی بسر کرتے ہیں تو یہ ہمارا مفروضہ ہے۔ دراصل زندگی خوش سی آزادسی اس زمیں پر موجودہ المناک صورت حال سے اگر ہٹ کر بسر کی جا سکتی ہے تو اس طرح کہ ہم فنون کے زیادہ ہوں، ورائی قسم کی سوچوں کے زیادہ ہوں، مثالیوں کے زیادہ ہوں، خوابوں کے زیادہ ہوں اور تخیلات کے زیادہ ہوں اور یہ میں یقیناً اس بنا پر کہہ رہا ہوں کہ بدن بھی چونکہ مادی ہے اس لئے وہ اگر کوئی پرواز نہ رکھے تو پھر کیا ہے اور یا پھر کیا اُس میں ہے۔ آخر میرا یہ مقطع

بھی تو حیات بلکہ مادی حیات کے قیود ہی نے مجھ سے کہلوایا ہے:

یہاں اُکتاہٹیں ہیں تُو بہ تُو مائل
مجھے جینے کو تاروں کا جہاں ہوتا

سو کوئی مانے یا نہ مانے، وجودی صبحوں کی بجائے تخیلاتی صبحوں سے ہی ہمیں زیادہ خوشی کی صورتیں بھی مل سکتی ہیں اور زیادہ آزادی کی بھی، کیونکہ مادے یا مادی صورتوں سے حد یا حدیں ہی پیدا ہوتی ہیں جو کہ ہمیں قید اور بس قید ہی رکھتی ہیں۔''

غزل کے کاملین و ماہرین فن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ صنف انتہائی نازک اندام اور کومل جذبات و احساسات کی حامل ہے لہٰذا اس میں فلسفیانہ موشگافیاں اس کے لطیف جذبات کی روح کو مجروح کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائی دور کے غزل گو شعرا کے دواوین میں فلسفیانہ اشعار خال خال نظر آتے ہیں۔ غالب وہ پہلا شاعر تھا جس نے فلسفیانہ موضوعات کو غزل کے لیے گوارا بنایا۔ وہ کوئی بڑا فلسفیانہ نظام تو نہ پیش کر سکے لیکن ان کی شاعری آج بھی صاحبانِ دانش کے لیے غور و فکر کے نئے دریچے وا کرتی ہے۔ غالب کے فلسفیانہ افکار سے متاثر ہونے والوں میں ایک اہم نام رب نواز مائل کا بھی ہے۔ انہوں نے عام شاعروں کی طرح غزل کو حسن و عشق کے سطحی جذبات پیش کرنے کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اس میں فکر و تعمق اور دانش و برہان کی پیش کش کو فوقیت دی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں انسان، خدا اور کائنات کو ایک جداگانہ تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی مشکور سعی کی ہے۔ انہوں نے کمال دانش مندی سے دنیا کی حقیقت صاحبان ادراک پر روشن کرنے کے بعد زندگی کو ''پتھر کی میلی آنکھ'' قرار دیا ہے۔

ہو نہ کوشش سے بھی جب یہ صاف کچھ
زندگی پتھر کی میلی آنکھ ہے

رب نواز مائل کی شاعری میں فلسفیانہ گہرائی اور گیرائی ملتی ہے۔ وہ کائنات کو جدید تناظر میں دیکھنے کی کاوش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار اول تا آخر قارئین کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یقین و نایقیں کے بیچ ہے کچھ
یہ پیدا جس سے اپنا ہر سفر ہے

....

کس فشارِ ذات کا یہ عہد ہے
جو نہ سالم دل ذرا پائے گئے

....

یہ کس ناتے عجب کس قحط کے ہیں
جو سب ہی محوِ صد فریاد سے ہیں

رب نواز مائل کی غزلوں میں فلسفیانہ رُخوں کو اُجاگر کرنے کا سبب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ عمومی اور سطحی موضوعات سے ان کا شعری مجموعہ بالکل تہی ہے، وہ ایک جانب تو غالب کی طرح فکر وفلسفہ پیش کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کے کلام میں خواجہ میر درد کی شاعری کے متصوفانہ موضوعات جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ رب نواز مائل کی شاعری غالب اور خواجہ درد کے شاعرانہ محاسن کا پُرتحمل اظہار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

بردۂ خواب خوش یا یوں ہی بس
اے جہاں، کچھ تو کہہ کیا ملے ہم

....

وہی مردان دل بھی صاف گو بھی
کہ جن کے ہاں ذرا بھی اب نہ تب تھے

متاعِ ہوش و زر تو چیز ہے کیا
کہ اپنی جان بھی جب اس کی ہی ہے

رب نواز مائل کی شاعری میں فلسفہ وحدت الوجود کے مظاہر بھی ہیں تاہم وہ فلسفۂ وحدت الشہود کے قائل ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ مظاہر کائنات کے عمیق مطالعہ ومشاہدے کے بعد ہی ہم ''حق'' کی اصل معرفت کر سکتے ہیں۔ رب نواز مائل کی شاعری فلسفۂ وحدت الشہود سے مالا مال ہے۔ وہ مظاہرِ کائنات کے ذریعہ معرفت خدا کے طلب گار ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار دیکھیے کہ ان میں کس طرح فلسفۂ وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے عناصر آمیخت ہوگئے ہیں۔

طربِ زارِ ہستی، تعب زار ہستی
تمہیں سے ہیں ہم اور کتنا جتانا

....

جبھی تو منظرِ ہر دید پہ وہ
ٹکا ہے یوں کہ ہم کو سب وہی ہے

....

جیسے بھی پاؤں تھے، جیسا بھی مَن
اس کے کچھ خوابوں تک تو گئے ہم

....

یہی چہرے عجب رنگت بھرے ان کے
حباب آسا نہ ہوں بھی تو نہاں ہوں گے

....

اسے دیکھا کہاں ہے تھوڑا بھی تو
سو دیکھوں گا ابھی اپنا جہاں میں

رب نواز مائل کی شاعری کے حوالے سے میرے پیش کردہ نکات سے یہ مغالطہ پیدا ہونے کا امکان ہے کہ ان کی غزلوں میں فکر وفلسفہ اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے اشعار زبان زد عام وخاص نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رب نواز مائل کے سینکڑوں اشعار عام قارئین کی توجہ اپنی جانب کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے اور رب نواز مائل کے منفرد موضوعات اور اسالیب سے لطف اٹھائیے تاہم یہ بات آپ کے پیش نظر رہے کہ یہاں بھی وہ اپنے موقف اور شعری نظریے سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے ہیں۔ ان اشعار میں ایک انفرادی رنگ ہے جو رب نواز مائل ہی سے مخصوص ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

جسے خالی اجل بھی کر سکے کیا
خیالِ یار کا ہوں وہ مکاں میں

....

زمیں و آسماں ایسے جہاں ہوں گے
تو کس ناتے بھلا ہم خوش کہاں ہوں گے

....

کہ جب ساری بساط اس کے تھی بس میں
سو ظالم ہم سے ہارا بھی تو کس دم

....

کالر پہ اپنے کوٹ کے بولو لگائیں کیا
یوں بھی گھڑی گھڑی نئی تہمت اٹھائیں کیا

....

یہ بھی تو عنایت ہے مرے حال پہ تیری
ماتھے پہ شکن آنکھ میں برسوں کی تمہارے

اک سفر سے یہ بھی رنگ اس کے ہوئے
بے نشہ ہم، بے مزہ رستے ہوئے

....

گزارے جس طرح یہ زندگی ہم کو
کبھی تو آپ بھی اس کو گزاریں ہم

....

ہم تو برسائیں گے آوازوں کے پتھر عمر بھر
چاہے تم محلوں کی دیواروں کو اور اونچا کرو

....

محبت کو جو دیکھیں آج کل ہم
محبت ہر جگہ بے رنگ سی ہے

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس کائناتِ رنگ و بو میں وہ شاعر شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربارے میں جگہ پائے گا جو محنت کو شعار بنائے گا۔ رب نواز مائل ان چنیدہ شاعروں میں ممتاز مقام پر فائز ہیں جنہوں نے عمر بھر محنت و مشقت کو اپنا شعار بنایا اور اپنے فلسفیانہ افکار و نظریات کے ذریعے اردو شاعری کو ایک نئے ذائقہ سے روشناس کرانے کا فریضہ بطریق احسن ادا کیا۔ ان کی غزلوں میں علوئے فکر بھی ہے یہی سبب ہے کہ سطحی شاعری کے دلدادہ اور رومانی جذبات کے حامل قارئین کے لیے ان کی شاعری میں حظ و مسرت کا سامان موجود نہیں ہے۔ وہ شاعری کی مقبول ڈگر سے ہٹ کر شعر کہتے ہیں اور یہی اختصاص انہیں اپنے ہم عصر شعرا سے منفرد اور ممتاز مقام عطا کرنے کا موجب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرزا غالب اور خواجہ درد کی شعری روایت کے امین رب نواز مائل کے شعری

مجموعے ''پتھر کی میلی آنکھ'' کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا جائے تا کہ اس کے جملہ محاسن ہمارے سامنے اُجاگر ہوسکیں ورنہ رب نواز مائل اپنے قارئین سے یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

کہاں سے لائیں کیا اس شاعری کو
جو سب کے نزد ہیں بے رنگ سے ہم

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۲۷ مارچ ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

اُجالوں کا سفیر۔ خورشید بیگ میلسوی

ایک سوال ناقدین اور دانش وروں میں ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کہ مہذب معاشروں میں تخلیق کار کی اصل حیثیت کیا ہوتی ہے؟؟ مختلف عہد کے دانش مندوں نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق اس سوال کے جوابات دیے ہیں تاہم تمام دانش جُو اس امر پر متفق ہیں کہ معاشرے کی اخلاقی سطح کو اُبھارنے کے لیے تخلیق کاروں کی محض موجودگی ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے۔ بعض دانش وروں اور فلسفیوں نے واضح کیا ہے کہ تخلیق کار چونکہ معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے لہٰذا اسے معاشرے کی تزئین و آرائش کے لیے اپنی جملہ صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ایک باشعور تخلیق کار محض سماج کی تخلیق نہیں ہوتا بلکہ وہ نئے نئے زمانے تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ تمام صبحیں اس کی مطیع اور تمام شامیں اس کی فرماں بردار ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تازہ افکار سے زمانے کے مردہ پیکر میں تابندہ روح پھونکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان تمام امور پر یدِ طولیٰ رکھنے کے باوجود ایک صالح تخلیق کار ''پبلک پراپرٹی'' ہوتا ہے۔ کسی مصلح یا عیسیٰ نفس تخلیق کار کا پبلک پراپرٹی ہونے کا مقصد و مطلب یہ ہے کہ اسے ذاتی نفع ونقصان سے بالاتر ہو کر عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے افکار ونظریات استعمال کرنے چاہئیں۔ جس طرح پبلک پراپرٹی پر ہر کس وناکس کا حق ہوتا ہے اسی طرح تخلیق کار پر بھی ہر انسان کا مساوی حق ہونا چاہیے۔

یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ ہمارے بعض تخلیق کاروں نے ساری زندگی شعروادب کے گیسو سنوارتے گزاری ہے۔ انہوں نے حرف ولفظ کی حرمت کا خیال رکھا ہے اور ظلم وجبر کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے ہیں۔ انہوں نے نہ تو ذاتی نمود ونمائش کی خاطر اپنی عزتِ نفس قربان کی ہے اور نہ دولتِ دنیا کے کے لیے اپنے ضمیر کا سودا کیا ہے۔ ان جلیل القدر اور صاحبانِ بصیرت تخلیق کاروں میں ایک اہم ترین نام **مرزا خورشید بیگ** کا بھی ہے جو ایک طویل عرصے سے صحرائے میلسی میں اپنے گلاب افکار ونظریات کی خوشبو بکھیرنے میں مصروف ہیں۔ اس خورشیدِ تاباں کی روشنی نے دنیائے ادب کے در وبام کو تو جگمگا دیا ہے لیکن مرزا خورشید بیگ صاحبانِ نقد ونظر سے آج بھی زیرِ لب شکوہ سنج ہیں:

خورشید صفت لوگ پسِ ظلمتِ شب ہیں
ہے دن کے اُجالوں کا نمائندہ کوئی اور

مرزا خورشید بیگ میلسوی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مرزا عبدالغفار بیگ ایک خدا ترس اور نیک منش انسان تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو نیک سیرت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور مرزا خورشید بیگ ان کی حسرتوں کا تابندہ مرقع بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔ مرزا خورشید بیگ نے ایک جانب تو اُردو فاضل کی سند امتیازی حیثیت میں حاصل کی اور دوسری جانب ہومیو پیتھک کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر کہلائے اور فدا بازار میلسی میں مسیحائی کے فرائض بحسن وخوبی ادا کر رہے ہیں۔

خورشید بیگ ایک طویل عرصے سے شعروادب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شاعری ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکی ہے۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے جوہر صنف نعت اور غزل میں کھل کر ہمارے سامنے آئے

ہیں۔ان کے درج ذیل مجموعے زیورِطبع سے آراستہ ہو چکے ہیں:

۱) ہجرتوں کے سلسلے (غزل)

۲) بشارتوں کے امین موسم (غزل)

۳) جمالِ نظر (نعتیں)

۴) بارش کے بعد (غزل)

اس کے ساتھ ساتھ ان کے درج ذیل نثری وشعری مجموعے اشاعت کے آخری مراحل میں ہیں:

۱) تو خالق ہے تو مالک ہے (حمد)

۲) لمحے کب زنجیر ہوئے (غزل)

۳) لبِ فرات (سلام ومنقبت)

۴) سخن سرائے (کلیات)

۵) نثری پیمانے (مضامین ومقالات)

خورشید بیگ میلسوی کو بے شمار سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کے نعتیہ مجموعے ''جمالِ نظر'' کو قومی سیرت ایوارڈ مل چکا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ متعدد علمی وادبی وثقافتی تنظیموں کی جانب سے انہیں بے شمار تعریفی اسناد، شیلڈز اور لوحِ اعزازات پیش کی جا چکی ہیں۔مختلف علمی وادبی انجمنوں نے ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں تقاریب منعقد کی ہیں اور بیسیوں معتبر ناقدین نے ان کی شخصیت اور فن پر مقالات لکھ کر انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔اسی طرح مختلف یونیورسٹیوں کی جانب سے ان کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر ایم۔اے اور ایم۔فل کی سطح پر تحقیقی مقالات لکھوائے جا رہے ہیں۔تاہم کمال یہ ہے کہ یہ مردِ درویش ان تمام اعزازات سے بے خبر اپنے خونِ جگر سے علم وہنر اور شعر وادب کی آبیاری میں محو ہے۔

طشتِ ہنر میں خون رگ جاں نچوڑ کر
لفظوں کو مثلِ لعل و گہر کر رہے ہیں ہم

مرزا خورشید بیگ میلسوی ایک صاحبِ طرز نعت نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی نعتوں کو محض حضورِ اکرمؐ کے شمائل تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے حالی کی طرح اپنی نعتوں میں سماجی مسائل و معاملات کی پیش کش کی ہے اور رسول اکرمؐ سے مدد کی التجا کی ہے۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ محض زمین و آسمان ہی حضورؐ کی محبت میں پیدا نہیں کیے گئے بلکہ ان کی شاعری کے وجود میں آنے کا بنیادی سبب ہی رسولؐ کی ذات والاصفات ہے۔

محمدؐ نے ہوتے، زمیں آسماں کی کہانی نہ ہوتی
مرے آج ہونے نہ ہونے کی کوئی نشانی نہ ہوتی
اگر ان کا لطف و کرم شامل حال میرے نہ ہوتا
خدا کی قسم میرے شعروسخن میں روانی نہ ہوتی

خورشید بیگ حالات کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کو احساس دلاتے ہیں کہ اگر وہ آج بھی سیرتِ رسولؐ کو صدقِ دل کے ساتھ اپنالیں تو وہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

گر تیرا تعلق ہے درِ شاہ اُممؐ سے
کیا خوف زمانے کے تجھے رنج و الم سے
دنیا میں نہ عقبیٰ میں کہیں اس کا ٹھکانہ
محروم جو رہ جائے تری چشمِ کرم سے

مرزا خورشید بیگ میلسوی ایک سنجیدہ فکر غزل گو ہیں۔ ان کی غزلوں میں محض قافیہ پیمائی نہیں ملتی بلکہ وہ حالات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی مسیحائی

کرتے ہیں۔ انہیں اس بات پر بے حد ملال ہے کہ آج کل لوگ مصلحت کوشی سے کام لے کر آمرانہ اور جابرانہ قوتوں کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں وہ ملک میں بڑھتی دہشت گردی، بے روزگاری، لاقانونیت اور فرعونی احکامات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے انتباہ کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اعلیٰ تر اخلاقی اور سماجی قدروں کو یونہی پامال کیا تو ہمارا نام ونشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔

صفحۂ ہستی سے آخر صورتِ حرفِ غلط مٹ جاؤ گے
گر یونہی اقدار کی تذلیل کرنے کا عمل جاری رہا

خورشید بیگ میلسوی کی شاعری میں عشق ومحبت کے جذبات بھی جلوہ گر ہیں۔ وہ عشق کو ایک سنجیدہ اور باوقار عمل سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں عامیانہ اور سطحی موضوعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ محبت کے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے اپنی نظر کو محترم رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ میرؔ کی طرح خود سپردگی کے قائل بھی ہیں اور غالب کی طرح عشق میں استحکام کے طلب گار بھی۔ انہیں علم ہے کہ آج جو بھی کشتِ تمنا میں خواب کے بیج بوئے گا اس کے نصیب میں آئندہ تروتازہ گلاب ہوں گے۔ وہ اپنے پاکیزہ جذبات کی ناقدری پر ملول ضرور ہیں لیکن انہیں پختہ یقین ہے کہ آنے والے زمانے میں ان مطہر جذبات کی قدر افزائی ضرور بہ ضرور ہوگی۔

تم کو مرے جذبات کی تفہیم نہیں ہے
سمجھے گا مرے عشق کو آئندہ کوئی اور

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مہذب معاشروں میں تخلیق کاروں کے لیے عزت وتکریم کے اسباب پیدا کیے جاتے ہیں اور انہیں ممکنہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں تاکہ وہ پرسکون طریقے سے شعروادب کی تخلیق کر

سکیں۔ یہ امر انتہائی حیرت انگیز ہے کہ پنجاب کے دور افتادہ علاقے میلسی میں تمام سہولتوں سے بے نیاز درویش منش اُجالوں کے سفیر مرزا خورشید بیگ اپنی چھوٹی سی کٹیا میں شعروادب کا ایسا چراغ روشن کیے بیٹھے ہیں جس کی روشنی سے عالم امکان جگمگا رہے ہیں۔

ظلمت کدوں میں فکر کے سورج اتار کر
تیرہ شبی کو نورِ سحر کر رہے ہیں ہم

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۵/اپریل ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

عزم وہمت کا شاعر ۔۔۔ اختر سعیدی

عصرِ حاضر میں ہمارے ادب کو سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہمارے تخلیق کاروں نے سچائی کا دامن چھوڑ کر منافقت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ ایک زمانے میں قلم کو حرمت کی علامت سمجھا جاتا تھا اور قلم کار معاشرے کا سب سے حساس اور معتبر فرد گردانا جاتا تھا لیکن آج خود ہمارے قلم کار نے قلم کی حرمت کو داغدار کر دیا ہے اور خود قلم کار معاشرے میں ''بکاؤ مال'' تصور کیا جاتا ہے۔ آج کی ادبی منڈی میں ہر قلمکار کی ایک قیمت مخصوص ہے۔ زور وزر کی بنیاد پر آپ جس سے جو جی چاہے لکھوا لیجیے۔ ایک زمانے میں صحافیوں کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنا قبلہ تبدیل کر لیتے ہیں لیکن آج کل تو ادیبوں اور شاعروں کا یہ حال ہے کہ وہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے پر اپنا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔ یہ منافقانہ طرزِ عمل ہمارے تخلیق کاروں کے لیے سمِ قاتل ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے معاشرے سے قلم اور قلم کار دونوں کا اعتبار جاتا جا رہا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں ایک ان پڑھ ایم۔ این۔ اے کی تو عزت ہوتی ہے لیکن بیسیوں کتابوں کے تخلیق کار کی کوئی توقیر نہیں ہے۔ اس بدترین صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟ میرے خیال میں خود ہمارا وہ تخلیق کار اس بدترین صورت حال کا ذمہ دار ہے جس نے اپنی عزتِ نفس اور قلم کی

آبرو انتہائی سستے داموں فروخت کر دی ہے۔ اس بدترین دور میں بھی یہ امر انتہائی حیرت انگیز اور قابلِ مسرّت ہے کہ ہمارے بعض تخلیق کاروں نے عمر بھر حق وصداقت کا علم سر بلند رکھا اور ظلم وتمرد کے سامنے کبھی خمیدہ سر نہیں ہوئے۔ ان تخلیق کاروں میں سے ایک اختر سعیدی بھی ہیں جنہوں نے عمر بھر مشکلات کا انتہائی ہمت وجرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنے دستِ ہمت سے جبین وقت پر یہ پیغام لکھ دیا ہے کہ ؎

عشق کی راہوں پہ چلنا ہے تو رسوائی نہ دیکھ
تجھ کو پانی میں اترنا ہے تو گہرائی نہ دیکھ

اختر سعیدی ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سندھ کے ایک خوبصورت اور مردم خیز شہر ٹنڈو آدم میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت جوہر سعیدی ایک خداترس، نیک خصلت اور راست باز انسان تھے اور پورے سندھ میں صاحبِ طرز شاعر کے طور پر مشہور تھے۔ وہ دنیاوی ہوا وہوس سے کوسوں دور تھے۔ اسی باعث انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پیشِ نگاہ رکھا۔ اختر سعیدی نے اپنی ابتدائی زندگی انتہائی عیش وآرام سے بسر کی مگر جلد ہی عسرت وتنگ دستی نے آن گھیرا اور انہیں تعلیم اُدھوری چھوڑ کر ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ انہوں نے ابتداً دفتری ملازمتیں اختیار کیں مگر بعد میں انہیں معروف روزناموں جسارت، جرأت اور جنگ میں ملازمت کے مواقع ملے اور انہوں نے اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا اور آج کل روزنامہ جنگ کراچی کے میگزین سیکشن سے متعلق ہیں اور اپنی صحافیانہ ذمہ داریاں انتہائی احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے باوجود انہوں نے اپنے اندر کے شاعر کو مرنے نہیں دیا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور طریقے سے اظہار کرتے رہے۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

''میرا نظریہ یہ ہے کہ تمام عہدے اور مناصب عارضی ہوتے ہیں۔

فرد معاشرے میں اپنے اچھے روّیوں اور تخلیقی قوت کے حوالے
سے زندہ رہتا ہے۔ صحافت میرا ذریعۂ معاش ہے، لیکن میں چاہتا
ہوں کہ میری شناخت، میری تخلیقات بنیں۔''

اختر سعیدی ایک شعری خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دادا، والد، چچا اور بھائی سب شاعر ہیں۔ اس صورت حال میں اپنا شعری رنگ نکالنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ تاہم اختر سعیدی نے محنت اور ذہنی صلاحیت کے باعث اپنا جدا شعری لہجہ تخلیق کیا اور باپ دادا کے نام کو روشن کرنے کا ذریعہ بنے۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

''یہ بات درست ہے کہ شاعری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ دادا
شاعر، والد شاعر، چچا شاعر، بڑے بھائی شاعر، لیکن میں خود کیا
ہوں؟ یہ وہ سوال ہے، جس کا جواب مجھے اپنی شاعری کے حوالے
سے دینا ہوگا۔ صرف وراثت سے بات نہیں بنتی، آدمی کو اپنے
زندہ رہنے کا جواز فراہم کرنا ہوتا ہے۔''

اختر سعیدی ایک طویل عرصے سے مشقِ سخن کر رہے ہیں۔ ان کے درج ذیل تین مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اربابِ دانش سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔

ا) چراغ جلنے تک

ب) فراق سے وصال تک

ج) ہوا، چراغ، آئینہ

آپ اختر سعیدی کے ان تینوں مجموعوں کا مطالعہ فرما لیجیے آپ کو ان میں ایک تازہ فکری کا احساس ملے گا۔ اختر سعیدی ان جدید شاعروں کے زمرے میں داخل نہیں ہیں جو ہر غلط سلط تجربے کو جدّت کے نام پر پیش کر دیتے ہیں بلکہ وہ اپنے تازہ افکار کو کلاسیکی روایت کے سائے میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری کلاسیکیت اور جدّت کا حسین

امتزاج بن کر ہمارے سامنے آتی ہے

جب اس کا حسن آئینہ سے محوِ گفتگو ہوا
بکھر رہی تھی روشنی، چراغ کے بغیر بھی

اختر سعیدی کی شاعری آفاقی اور اخلاقی اقدار سے مالا مال ہے۔ وہ خدا، کائنات اور انسان کے ارفع تصور کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں علوئے فکر بھی ہے اور انسان دوستی بھی۔ آپ ان کی پوری شاعری کا بغور مطالعہ کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ خوبصورت تشبیہات، استعارات اور تلازمات سے پُر ہے۔ ہوا، آئینہ، چراغ، وصال، شجر، دشت، فراق، قافلے، صحرا، خواب، گھر، آنکھیں، روشنی، مکان اور اسی قبیل کی سینکڑوں علامتیں اختر سعیدی کی شاعری میں نئی معنویت کا احساس دلاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اختر سعیدی نے محض اپنی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ہی کو پیش کرنے کی کاوش نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنے افکار و اسالیب کے ذریعہ اردو شاعری کو ایک نیا ذائقہ اور لہجہ دینے کی بلیغ سعی کی ہے جو لائق توجہ بھی ہے اور قابلِ صد تحسین بھی۔ اس سلسلے میں اُن کی مختلف غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

میری آنکھوں میں ہیں جلوے تری یکتائی کے
بند ہوں گے نہ دریچے کبھی سچائی کے

....

جب تشنگی بڑھی تو مسیحا نہ تھا کوئی
جب پیاس بجھ گئی تو سمندر ملا مجھے

....

بیتے لمحے یاد نہ کرنا تُو ورنہ
بہہ جائے گا جو پانی ہے آنکھوں میں

مدتوں صحرا نوردی کی مرے اجداد نے
مجھ کو ورثے میں جنونِ آبلہ پائی ملا

....

روایتوں کے سلسلے کہاں گئے خبر نہیں
وہ جو چراغ تھے نئے کہاں گئے خبر نہیں

....

فصیلِ جسم سے باہر بھی جھانک کر دیکھا
مجھے تو میرے برابر نہیں ملا کوئی
یہ خودسری کا عجب دور ہے کہ اختر سے
غریبِ شہر سمجھ کر نہیں ملا کوئی

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں تخلیق کاروں نے شعروادب کے معیار کو برباد کر کے رکھ دیا ہے تاہم اختر سعیدی جیسے چند ''سرپھرے'' تخلیق کار ضرور موجود ہیں جو اپنے خونِ جگر سے شاعری کی کھیتی کو سرسبز وشاداب کر کے شاعری کے وقار اور اعتبار کو زندہ کرنے میں مصروف ہیں۔

میں ایک فرد ہوں اختر قلم قبیلے کا
میں جانتا ہوں وقارِ سخنوری کیا ہے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن'......۶ نومبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۸ جنوری، ۲۸ نومبر ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

مثبت قدروں کی حامل تخلیق کار۔ نجمہ سہیل

کسی بھی مہذب معاشرے کی تشکیل میں عورت کا کردار اساسی رہا ہے۔عورت کو ہر عہد میں 'تخلیق' کی معتبر علامت تصور کیا جاتا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تہذیبی ترقی اور تمدّنی ارتقا میں عورت کا کردار مرد سے کسی بھی طرح کمتر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ دانش مندوں کے نزدیک مرد اپنے پدری یعنی تنظیمی اور عورت اپنے مادری یعنی تخلیقی اصولوں کے تحت معاشرے کی پرورش و پرداخت کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے سے عورت کی اساسی حیثیت کو ختم یا کمزور کرنے کا واضح مطلب معاشرے کو''بانجھ'' بنانے کے مترادف ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ تہذیب یافتہ ہو اور اس میں تخلیقی نشو ونما کا سفر نہ رکے تو ہمیں اپنی سوسائٹی میں عورت کو اس کا جائز مقام دینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ یوں تو معاشرے کی ہر عورت قابلِ قدر اور لائق صد تکریم ہے تاہم وہ عورتیں ہمارے سلام کی مستحق ہیں جو امورِ خانہ داری کے ساتھ ساتھ نظام کائنات کی تزئین و آرائش میں بھی اپنا مثبت کردار ادا کر رہی ہیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ایک ایسی ہی تخلیق کار محترمہ **نجمہ سہیل** ہیں جو ربع صدی سے علم و ادب کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ انہیں نہ تو ستائش کی تمنا ہے اور نہ وہ کسی صلے کی تمنائی ہیں۔ وہ کسی

لق و دق صحرا میں کھلے ایک ایسے پھول کی مانند ہیں جو بے نیازی سے اپنی خوشبو بکھیر نے میں مصروف ہے۔ کسی صحرا میں پھول بن کر خوشبو بکھیرنا ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جو برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ نجمہ سہیل خوش بخت ہیں کہ انہوں نے صدیوں کا یہ سفر لمحوں میں طے کر لیا ہے۔

جانے کیا لہر ہے جو ہم کو لیے پھرتی ہے
روشنی اپنے مقابل کبھی ایسی تو نہ تھی

نجمہ سہیل لاہور کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ماجد خواجہ محمود احمد علم دوست انسان تھے لہٰذا انہوں نے اپنی اولاد کو بہترین تعلیم دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ نجمہ سہیل نے لیڈی میکلیگن سکول لاہور سے میٹرک، لاہور کالج برائے خواتین سے ایف۔اے، بی۔اے اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے کیا اور آج کل لاہور کالج یونیورسٹی لاہور میں ریٹائر ہونے کے بعد بھی طالبات کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہی ہیں۔ نجمہ سہیل کی خوش بختی تھی کہ وہ شادی کے بعد ایک علمی خاندان سے ایک ادبی خاندان میں تشریف لے آئیں۔ ان کے شوہر نامدار معروف نقاد اور دانش ور ڈاکٹر سہیل احمد خاں مرحوم تھے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں ایک ہشت پہلو نگینہ تھے اور ان کی شخصیت اور فن کا ہر پہلو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ایک تازہ فکر نقاد اور عمیق مطالعہ دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ بے مثال استاد بھی تھے۔ انہوں نے دانش و حکمت کی جو ارفع روایات اپنے اجداد اور اساتذہ سے حاصل کی تھیں وہ اپنے تلامذہ میں بطریقِ احسن تقسیم کر دی ہیں۔ آج اُردو شعر و نقد پر جن نوجوان احباب کا تصرف ہے وہ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد خاں مرحوم کے خوشہ چیں رہے ہیں۔ نجمہ سہیل کی ادبی و شعری پرداخت میں بھی ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا کردار اساسی رہا ہے۔

نجمہ سہیل ایک سلجھی ہوئی تخلیق کار ہیں۔ وہ دوسری تخلیق کار خواتین

کی طرح کتابوں کی اشاعت پر زور دے کر ان کی تعداد میں روز افزوں اضافے کی متمنی نہیں ہیں بلکہ وہ مقدار کے بجائے معیار کی طرف توجہ دیتی ہیں۔ ان کی درج ذیل کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

۱) آگہی کا درد (شعری مجموعہ)

۲) لفظ آئینہ بنے (مضامین، خاکے، رپورتاژ)

۳) زندگی کے تعاقب میں (کہانیاں)

۴) گمشدہ ہندسہ (کہانیاں)

۵) جانے پہچانے (خاکے)

۶) اس خرابے میں (کہانیاں)

درج بالا کتب کے موضوعات کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے ہم نجمہ سہیل کے تخلیقی سفر کو درج ذیل پانچ حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں:

۱) شاعر ب) مضمون نویس ج) افسانہ نگار

د) خاکہ نگار ر) رپورتاژ نگار

اب ذیل میں نجمہ سہیل کے پانچوں تخلیقی رُخوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

شاعری انسانی جذبات واحساسات کی آئینہ ہوتی ہے۔ تخلیق کار جس قدر حساس ہوتا ہے اتنا ہی اس تخلیق میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ نجمہ سہیل کی شاعری ان کے جذبات واحساسات کی بھرپور آئینہ دار ہے۔ وہ نہ تو کسی عالم گیر مسئلے کو اپنی ذات کا مرکز بناتی ہیں اور نہ ملکی سیاست یا معیشت ان کی شاعری کا بنیادی نکتہ بنتی ہے۔ وہ تو ذاتی تجربے اور مشاہدے کو اپنی شاعری میں سمونے کی کوشش کرتی ہیں۔ نجمہ سہیل کے بارے میں مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو وہ میر و غالب کی طرح اپنی شاعری میں فلسفیانہ

موشگافیاں کرتی ہیں اور نہ اقبال کی طرح کوئی فکری نظام مرتب کرتی ہیں بلکہ وہ ایک عورت کی آنکھ سے کائنات کو دیکھتی ہیں اور جو کچھ محسوس کرتی ہیں وہ نسائی جذبات کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں نہ تو تصنع ہے اور نہ بناوٹ۔ انہوں نے سادہ خیالات کو سادہ الفاظ میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ ان کا شعری سفر ابھی جاری ہے اور اسی باعث انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ اپنے اندر زندہ رکھنا ہے۔

اڑائے پھرتا ہے یوں شوق جستجو مجھ کو
حسین لگتے ہیں اب مرحلے سفر کے مجھے

محترمہ نجمہ سہیل ایک معتبر نقاد کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کے متنوع علمی و ادبی مضامین معتبر جرائد میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر صاحبانِ علم و فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ''لفظ آئینہ بنے'' میں ان کے درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱) میر تقی میر کی خود نوشت سوانح 'ذکرِ میر' پر ایک نظر

۲) مجید امجد کی انفرادیت

۳) جہانِ دانش۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

۴) حاجرہ مسرور کی افسانہ نگاری

نجمہ سہیل کے تمام مضامین و مقالات ان کی نیک نفسی، وسیع مطالعہ اور پر لطف اسلوب کے باعث باذوق قارئین کے دلوں پر دستک دینے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ ان مضامین میں کلیم الدین احمد کی طرح قطعیت اور حسن عسکری کی طرح عمیق نگاہی تو نہیں ملے گی البتہ ایک ایسی شریف النفس اور خوش اطوار نقاد کی مہک ضرور محسوس ہو گی جو لوگوں کی پگڑیاں اُچھالنے کے بجائے ان کی دستار بندی کا فریضہ ادا کر رہی ہے۔ نجمہ سہیل کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت و بصارت ان کے روشن مستقبل کی نوید سنا رہی ہے۔

نجمہ سہیل ایک معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے ''زندگی کے تعاقب میں''، ''گمشدہ ہندسہ'' اور ''اس خرابے میں'' شائع ہو کر اربابِ فہم وذکا سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ نجمہ سہیل نے اُردو افسانے کی بدلتی کروٹوں کو محسوس کیا ہے۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ مغربی افکار کی یورش کے بعد اُردو افسانے کو اپنے رنگ و روپ کو کس طرح بدلنا پڑا ہے۔ اب بات چیخوف اور موپساں کے افسانوں سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ انہوں نے افسانوں کے بدلتے ہوئے رنگ و روپ کو قبول تو کیا لیکن انہیں بعینہ اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے بعض افسانے ان کی جدّت پسندی کی خبر دیتے ہیں لیکن نجمہ سہیل نے ان کا مزاج قطعی طور پر تبدیل کرنے کی کاوش نہیں کی۔ اس سلسلے میں ان کے افسانوں گمشدہ ہندسہ، کیا صحیح کیا غلط، اپنی اپنی سرشت وغیرہ کا مطالعہ کیجیے تو کہیں کہیں نادر علامتیں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ نجمہ سہیل کا وصف یہ ہے کہ انہوں نے جدت کے شوق میں اس تجریدی یا علامتی افسانے سے اپنا رابطہ قائم نہیں کیا جو ابہام پیدا کرتا ہے۔ نجمہ سہیل نے سادگی میں پُرکاری کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں سادگی بھی سہلِ ممتنع کا رنگ اختیار کر گئی ہے۔

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی صنف کو معتبر بنانے والوں میں ایک اہم نام نجمہ سہیل کا بھی ہے۔ اُردو ادبیات کی ایک مستند معلّمہ ہونے کے باعث کلاسیکی ادب پر ان کی نگاہ بہت گہری اور وسیع ہے۔ نثر و شعر کے تمام پرلطف ذائقوں سے آشنا ہونے کے بعد نجمہ سہیل نے صنفِ خاکہ کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور وہ بڑی مستعدی اور مہارت سے ایوانِ خاکہ کو اپنے افکار و نظریات سے زرخیز کرنے میں مصروف ہیں۔

اُردو میں رپورتاژ کی روایت کو استحکام عطا کرنے والوں پر ایک اہم اسم نجمہ سہیل کا بھی ہے۔ انہوں نے اس صنف میں اگرچہ کم کم طبع آزمائی کی ہے مگر اپنے اندازِ فکر و نظر کی بدولت وہ اس صنف میں ایک منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ ان کی کتاب

''لفظ آئینہ بنے'' میں ایک رپورتاژ بھی شامل ہے جو ان کے دورۂ جاپان سے متعلق ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ کسی بھی معاشرے کو تہذیب یافتہ اور تخلیقی طور پر زرخیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عورتوں کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کریں اور ان کے افکار و نظریات سے بیش از بیش فائدہ اٹھائیں۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ نجمہ سہیل نے اس بنجر اور غیر تخلیقی معاشرے میں اپنی نثری و شعری تخلیقات کے ذریعہ ایک علمی و ادبی ماحول پیدا کرنے کی شعوری کاوش کی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایسی ہمہ جہت تخلیق کار کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ ہمارے معاشرے میں ادبی روّیوں کو پنپنے کا موقع مل سکے۔ اگر ہم نے خواتین تخلیق کاروں کے ساتھ بے اعتنائی کا روّیہ جاری رکھا تو آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۲۵ جنوری، ۲ جولائی، ۱۷ مارچ ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور......۱۶ ر فروری ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن'......۸ مارچ ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

ذات سے کائنات تک کا مسافر۔ جمیل صادق

عصر حاضر میں ہماری زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب ہم اس بارِ گراں کو اپنے سر سے اتارنے کے قابل بھی نہیں رہ گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا ہر فرد ذاتی مصائب اور معاشرتی آلام کی چکی ہیں بُری طرح پس چکا ہے۔ آفاقی قدروں کے زوال نے اسے مزید دل گرفتہ کر دیا ہے۔ وہ اپنی چشمِ حیراں سے جو دردناک مناظر دیکھ رہا ہے وہ اس کے وہم وگمان سے بھی بعید ہیں۔ اب تو ہر شخص جبرِ مسلسل کی طرح اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ نہ تو کسی کو منزل کی خبر ہے اور نہ کوئی مقصدِ حیات رکھتا ہے۔ وقت کے اس سیلِ بے کنار میں سب بے سمت رواں دواں ہیں۔ عام انسانوں کا تو علم نہیں لیکن حساس ذہن رکھنے والے تخلیق کار اس صورتِ حالات کے باعث کبیدہ خاطر ہیں۔ ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی، ناانصافی، بے روزگاری اور بے یقینی نے تخلیق کاروں کو عدم تحفظ کا شکار کر دیا ہے۔ اس بدترین دور میں بھی ایک شاعر **صادق جمیل** اپنے ہاتھ میں خوشبو کا علم لے کر یہ پیغام دے رہا ہے کہ۔

خوف بارود کا ذہنوں کو نہ کر دے مسموم
لے کے خوشبو کا علم گھر سے نکل آیا ہوں

صادق جمیل ایک طویل عرصے سے مشق سخن کر رہے ہیں تاہم ان کا ایک ہی شعری مجموعہ (دربدر) زیورِ طبع سے آراستہ ہوسکا ہے اور انہوں نے ''دربدر'' کی شاعری

کو لمبی ریاضت کا چھوٹا سا لمحہ قرار دیا ہے۔ شہزاد احمد نے صادق جمیل کی شاعری کو باطن کے مناظر سے مربوط کیا ہے جبکہ شاہد شیدائی نے ''دربدر'' کی شاعری کو اس آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو قرار دیا ہے جو صدیوں سے ایک فرحت آفریں لمحے کی منتظر ہے۔ اسلم کولسری نے صادق جمیل کی شاعری کو طلسماتی قرار دیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ ان کے کلام کو جتنی بار بھی پڑھا جائے لطف کی ایک نئی لہر آدمی کو چھو کر گزر جاتی ہے۔ میری ناچیز رائے میں جمیل صادق کی شاعری ان کی ذات سے کائنات تک کے سفر کی دلچسپ اور پر لطف روداد ہے۔

صادق جمیل چشمِ بینا رکھتے ہیں لہٰذا وہ اپنے معاشرے کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ اپنے وطنِ عزیز میں گرتے ہوئے بارود کے گولے بھی دیکھتے ہیں اور اپنی ہی لاشوں پر رقص کرتے ہوئے بے حس اور بے ضمیر افراد بھی ان کے پیشِ نظر ہیں۔

میرے گھر بارود کے گولے گرتے ہیں
ایسے خواب برابر دیکھ رہا ہوں میں

....

آنکھیں اندھی ہونا چاہیں
خونی منظر دیکھیں کثر

....

رقص اپنی ہی لاش پر ہے جمیل
کتنے سفاک ہو گئے ہیں ہم

....

تاریخ ہے رقم مرے زخمی وجود پر
لاکھوں زمانے دفن ہیں اک اک خراش میں

وہ اس سفاک زمانے کی دست برد سے بچنے کے متمنی تو ہیں مگر انہیں خبر ہے کہ سیلِ زمانہ میں ایک قطرہ کچھ کرنے کا اہل ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے آفت زدہ اور آسیب نشان شہر میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

شہر سارا جمیل ہے برباد
کون دے گا یہاں پناہ مجھے

صادق جمیل حالات کی یورش سے افسردہ و پرملول ضرور ہیں لیکن ان کی خواہش ہے کہ ہمارے وطن سے کسی طرح یہ آسیبی ماحول ختم ہو جائے اور ہمارا وطن امن و امان اور آشتی کا گہوارہ بن جائے۔

بدن پہ داغ جو اتنے سجا کے آیا ہوں
میں ایک دشت کی قسمت جگا کے آیا ہوں
جہاں شکست کی تاریکیاں تھیں چاروں طرف
وہیں میں فتح کے سورج اُگا کے آیا ہوں

صادق جمیل کی شاعری میں جدت اور کلاسیکیت کا پرلطف امتزاج ملتا ہے۔ وہ فکر کے اعتبار سے جدید اور فنی لطافتوں کے حوالے سے کلاسیکی ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار اتنے بے ساختہ ہیں کہ کلاسیکی شعرا کی یاد دلاتے ہیں۔ پرانے ساغر میں نئی شراب عطا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اس کے لیے مروجہ علوم پر دسترس اور فن پر گرفت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ جمیل صادق کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور ان میں تازہ پھولوں کی خوش گوار مہک محسوس کیجیے۔

اس کے نقصان میں سورج کی طرف داری ہے
زندگی برف کے پتلوں کی خریداری ہے

تم جسے منظرِ پرلطف سمجھ بیٹھے ہو
لاشۂ برگ پہ شبنم کی عزاداری ہے

....

اُجالوں نے اندھیری رات دی ہے
مجھے میرے لہو نے مات دی ہے
مرے کاسے میں ہیں پانی کے سکے
سخی تو نے یہ کیا خیرات دی ہے

....

دیکھ تصویر کے اندر سے نکل آیا ہوں
میں تجھے ڈھونڈنے منظر سے نکل آیا ہوں
جو مجھے دیکھے اسے یاد، خدا آتا ہے
پھول ہوں اور میں پتھر سے نکل آیا ہوں

دانش مندوں کا کہنا ہے کہ خود آگاہی اور خودشناسی کے مراحل طے کرنے والا انسان ہی خداشناسی کا دعوے دار ہو سکتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اپنے نفس کو پہچان لینے والا ہی حق کی حقیقی معرفت کا اہل قرار پا سکتا ہے۔ جمیل صادق کی شاعری میں خدا شناسی سے زیادہ خودشناسی کی کیفیات اُجاگر ہوتی ہیں۔ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں اپنے بچھڑے اور بکھرے وجود کو تلاش کرنے میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔ ''دربدر'' میں ایک ایسے شاعر کی حقیقی داستان پوشیدہ ہے جو اپنا خال وخط اور وجود کھو بیٹھا ہے مگر اپنی ذات کی کرچیاں جمع کرنے میں مگن ہے۔

اپنا نام پتا اور اپنا چہرہ ہم کو بھول گیا
اس کے علاوہ کیا بتلائیں کیا کیا ہم کو بھول گیا

شہر کی گلیوں میں کھو جانا کوئی انوکھی بات نہیں
اپنے گھر سے اپنے گھر کا رستہ ہم کو بھول گیا

....

کھنڈر ہوں یا کوئی اُجڑا گھروندا لگ رہا ہوں
میں نو تعمیر بھی صدیوں پرانا لگ رہا ہوں
نہیں پہچان پائے تم مجھے تو کیا عجب ہے
میں اپنے آپ کو بھی اجنبی سا لگ رہا ہوں

....

ایک رنگیں جہان میں گم ہوں
جب سے میں تیرے دھیان میں گم ہوں
ہر طرف آہٹوں کا میلہ ہے
کیسے خالی مکان میں گم ہوں

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جمیل صادق اپنے بکھرے ہوئے وجود کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں......؟؟؟ میرے خیال میں صادق جمیل کا شاعرانہ کمال یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے آپ کو تلاش کرلیا ہے بلکہ ان کا حقیقی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمارا کھویا ہوا وجود تلاش کر کے ہمیں لوٹا دیا ہے۔ درحقیقت ایسی شاعری ہی خودشناسی سے خداشناسی کے تمام راستے طے کرادیتی ہے۔

سوچوں سے بھی عکس بنایا جا سکتا ہے
اندھی آنکھوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے
ہم سے تو آباد نہ ہو پایا اک گھر بھی
تم چاہو تو شہر بسایا جا سکتا ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر میں ہماری زندگی ایک وبال بن چکی ہے اور اس پرفتن معاشرے میں سانس لینا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اس بدترین صورتِ حال میں بھی ہمارے تخلیق کار عزم و ہمت اور امید و رجا کا چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں۔ یہ صرف اور صرف ان صالح اور نیک صفت تخلیق کاروں کی پیہم کاوشوں کا ثمر ہے کہ آج ہم اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ صادق جمیل کا اختصاصی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ''دربدر'' کے ذریعہ ہمیں دربدر ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم جمیل صادق کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں اور ان کے مقام و مرتبہ کا بارِ دگر تعین کریں ورنہ وہ ہر محفل میں صاحبان نقد و نظر سے یہی شکوہ کریں گے۔

اب تو تسلیم کریں مجھ کو زمانے والے
اب تو سورج کے برابر سے نکل آیا ہوں

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۳۰/اپریل ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۷ مئی ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

صحرائے قطر کا آہو ——— محمد ممتاز راشد

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ عصرِ حاضر کی تنقید، تحسین اور تنقیص کے دائروں میں بٹ گئی ہے۔ بیشتر تنقیدی مقالات یا تو ''ستائش باہمی'' کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں یا کسی ''برہمی'' کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں قاری کا اس ''شکستہ تنقید'' سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ تنقید پر قاری کے اعتبار کو بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عصرِ حاضر کے ناقدین غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں، ورنہ تنقید کی اس ناگفتہ بہ صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین بھی کرکٹ کی دنیا کی طرح ادبی دنیا میں ''نیوٹرل نقاد'' کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

عصرِ حاضر میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی ایک جمود کی کیفیت طاری ہے۔ معاشرتی اور سیاسی شکست و ریخت کے اثرات ادب پر بھی مرتسم ہو رہے ہیں اور غالباً اسی زبوں حالی کی بنا پر ادیب، ادب اور قاری کی مثلث ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ ادیب قاری کے تقاضوں سے ناآشنا ہے اور قاری ادیب کے خیالات و نظریات سے بے خبر رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس دورنگی نے ادب کو ''چوں چوں کا مربہ'' بنا دیا ہے۔ نظریہ سازی کا فقدان ہوتا جا رہا ہے اور اب ہوا کے رُخ پر چلنے والے بادنما ادیب نظریہ ساز شمار ہونے لگے ہیں۔ ادیب ذاتی فوائد کے حصول

کے لیے قلم کو بیچ چکے ہیں اور اسی بنا پر قاری کا رُخ ادبی وشعری کتب سے ہٹ کر جاسوسی رسائل کی طرف پھر گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ادیب اور شاعر اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھیں اور قاری کے لیے ایسی نثری وشعری تخلیقات پیش کریں جو ان میں ذوق پیدا کرنے کا موجب بنیں۔ اُردو میں ایسے بے شمار تخلیق کار ہیں جنھوں نے معاشرتی روّیوں کی پیش کش کے لیے اپنی تخلیقات کو وقف کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ہر تخلیق کو معاشرے کے کسی نہ کسی رویّے کا مظہر بنانے کی کاوش کرتے ہیں۔ **محمد ممتاز راشد** بھی ان چنیدہ تخلیق کاروں میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی شاعری اور نثر کو ذات اور کائنات دونوں کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ذات سے آفاق اور آفاق سے ذات کے تشکیلی مراحل بحسن وخوبی ادا کر رہے ہیں۔

محمد ممتاز راشد کی یوں تو ہر تخلیق اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہم اور لائق توجہ ہے تاہم ''اک بات محبت کی'' اس اعتبار سے قابلِ قدر ہے کہ اس میں انسان کے بنیادی جذبے ''محبت'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ موضوع جہاں ایک جانب قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے وہاں دوسری جانب ممتاز راشد کی بے پناہ صلاحیتوں کا مظہر بھی ہے۔ ممتاز راشد کا وصف خاص یہ ہے کہ انھوں نے ہم عصر شعرا کی طرح اس پامال موضوع کو سطحی جذبات کی سیرابی کے لیے مخصوص نہیں کیا بلکہ محبت کو علوئے فکر کے لیے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے محبت کی اک بات سے سینکڑوں قصے اُجاگر کیے ہیں گویا اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی مشکور سعی کی ہے۔ اگر آپ ممتاز راشد کے تخلیقی دوائر سے آگاہ ہیں تو آپ کو علم ہو گا کہ غزل ان کے تخلیقی ہنر کا بنیادی دائرہ ہے اور اس دائرے کا مرکزی نقطہ محبت ہے۔ آپ ان کی غزل کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انھوں نے محبت کے کیا کیا روپ اور مظاہر پیش کیے ہیں:

اظہار محبت میں نہیں دیر لگائی
صد شکر کہ یہ کام تو برجستہ کیا ہے

....

یونہی جب وہ نیلے پیلے ہوتے ہیں
پیار بڑھانے کے یہ حیلے ہوتے ہیں

ممتاز راشد کی غزلوں میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو جسمانی طور پر وطن سے دور رہ کر بھی روحانی اور قلبی طور پر خود کو وطن میں محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کی تفرقہ بازی اور دہشت گردی سے نالاں ہے اور یہاں کی ظلم وستم کی داستانیں اسے بے قرار کر دیتی ہیں۔ وہ جھوٹ، فریب، ریاکاری، خوش کن وعدوں، افلاس، منافقت، فقہی اختلافات، زیست کے حادثات، معاشرتی ناانصافی اور حاکمانِ بے چہرہ سے زچ ہو کر اپنے ہم وطنوں سے التماس کرتا ہے کہ:

جسے چاہو اسے رسوا نہ کرنا
ستم کرنا مگر ایسا نہ کرنا
بہت اُجلا ہے آنگن قربتوں کا
جدائی سے اسے میلا نہ کرنا

ممتاز راشد وطن سے دور رہنے کے باوجود وطن کے معاملات سے لاتعلق نہیں ہیں۔ وہ اپنے وطن کے موسموں، رنگوں، تتلیوں، پہاڑوں، صحراؤں، بہاروں، دریاؤں، غرض ہر چیز سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان کا وطن رشکِ بہشت ہے اور وہ اپنے وطن کے لیے ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اپنے وطن پاکستان سے والہانہ محبت کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے قطر جیسے صحرائی علاقے میں اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔ انھوں نے

اپنے ادبی جریدے ''خیال وفن'' کے ذریعہ سے بے شمار تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور نوجوان لکھنے والوں کو اُردو زبان سے رغبت دلانے اور پاکستان سے محبت کا جذبہ بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہی دونوں عوامل ان کے افکار ونظریات کے لیے بھی مفید ومعاون ثابت ہوئے ہیں۔

ممتاز راشد کا اختصاص یہ ہے کہ وہ حالات کی یورش اور تقدیر کی بے حسی سے گھبراتے نہیں بلکہ نامساعد حالات میں بھی اُمید کے چراغ جلاتے ہیں۔ وہ غم انگیز ماحول میں بھی مسکرانے کا عزم رکھتے ہیں اور اہلِ دنیا پر واضح کرتے ہیں کہ عقل مند وہ ہوتا ہے جو سخت اور ترش حالات میں بھی خوشگوار اور شیریں زندگی گزارنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ راشد کی یہی رجائیت انہیں ہم عصر شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سدا سہولتیں پیدا کرو جہاں کے لیے
نشانِ راہ بنو اہلِ کارواں کے لیے
کہیں ہے کوئی رکاوٹ تو غم نہیں راشد
بہت سے اور بھی رستے ہیں کارواں کے لیے

اب چلتے چلتے چند باتیں ممتاز راشد کے اسلوب کے بارے میں بھی سُن لیجیے۔ ممتاز راشد کی غزلوں میں غیر محسوساتی طریقے سے ٹ، ڈ اور ڑ کے حروف کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا لفظوں کا ساختیاتی نظام کہ یہ تینوں حروف غزل کے کومل جذبات کے اظہار میں مانع ہیں۔ ممتاز راشد نے شیخ امام بخش ناسخ کی طرح کمال یہ دکھایا ہے کہ غیر مانوس الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ ہر دل عزیز بن جاتے ہیں۔ ممتاز راشد زبان وبیان پر مہارت رکھنے والے کلاسیکی شاعر تو نہیں ہیں لیکن آپ ان کی غزلوں کی ردیفوں کا مطالعہ فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ ان پر دبستانِ ناسخ کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔

جو نہیں اپنی ذات سے مانوس
کیسے ہو کائنات سے مانوس

ممتاز راشد کا اسلوبِ شعر دوسرے شعرا سے منفرد نظر آتا ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست اور تراکیب و مرکبات کا استعمال واضح کرتا ہے کہ ممتاز راشد الفاظ کے تہذیبی سیاق وسباق سے کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ وہ علم بیان و بدیع کے استعمال پر بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے خیال کی انفرادیت کو لفظی اُلٹ پھیر کے لیے کہیں بھی قربان نہیں کیا۔ ممتاز راشد زبان و بیان کی نزاکتوں سے آگاہ ہیں اور یہی چیز انہیں دوسرے شاعروں سے نمایاں کرنے کا سبب ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شعرا کو چاہیے کہ وہ اپنے شعری افکار کے ذریعہ قارئین کو ادب کی جانب مائل بھی کریں اور عملی زندگی میں اپنے موضوعات کے ذریعہ ان کی سمت نمائی بھی کریں۔ ہمارے لیے یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ ''اک بات محبت کی'' میں ممتاز راشد نے یہ دونوں امور حُسن اور سلیقے سے انجام دیے ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے اور لطف یہ ہے کہ اپنی عاجزی کے باعث وہ آج بھی اہلِ دانش سے کہہ رہے ہیں کہ

ہزار شعر بھی لکھتا ہوں نثر بھی راشدؔ
کہاں ہے منزلِ شعر و ادب نہیں معلوم

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۲۱؍اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۲۶ جولائی ۲۰۰۸ء، ۷ مارچ ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

•••

ڈاکٹر کنول فیروز۔ محبت اور سچائی کا علمبردار

یہ امر انتہائی المناک ہے کہ عصرِ حاضر میں ہمارے اندر سے قوّتِ برداشت کم ہوتے ہوتے بالکل نابود ہوگئی ہے۔ سیاست ہو یا مذہب، معاشرت ہو یا ادب ہر جگہ جذباتیت نے اپنے ڈیرے لگا لیے ہیں۔ اب تو ہمارے اندر سے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ سیاست میں اقتدار کی ہوس کے باعث جذباتی ہو جانے کے معنی تو سمجھ میں آجاتے ہیں اور اسی طرح مذہب و معیشت و معاشرت میں جذباتی روّیوں کی آبیاری تو صاحبانِ فہم و ذکا کی تفہیم کے لیے سہل ہے لیکن کسی کا ادب کی اقلیم میں جذباتی ہو جانا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم شعروادب کے معاملات میں بھی جذبات کو ہر چیز پر مقدّم قرار دے دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل ادب کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ ادب نظریہ ساز ہوتا ہے۔ آپ کسی سے نظریاتی اختلاف کرتے ہیں تو یہ عمل مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ذاتی عناد کو ادب کے پردے میں چھپا کر پیش کرنا ادبی بد دیانتی ہے۔ ہمارا واضح موقف یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں عموماً اور ادب میں خصوصاً برداشت کو اہمیت دی جانا چاہیے تا کہ معاشرے میں شعروادب کی تخلیق کے لیے مناسب اور سازگار ماحول پیدا ہو سکے۔ اگر ہم نے اپنے سطحی اور مذموم مقاصد کے حصول کے لیے فنونِ لطیفہ کو استعمال کیا تو آنے والا وقت ہمیں

کبھی معاف نہیں کرے گا۔ یہ امر انتہائی خوش آئند ہے کہ اس پر آشوب معاشرے میں ایک فردِ فرید ایسا بھی ہے جو ایک طویل عرصے سے پورے معاشرے میں محبت، اخوت اور بھائی چارے کی مشعل روشن کر کے اہلِ دنیا کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ انسانیت اور آدمیت کی قدر و منزلت کرنے والی قومیں کامیاب و کامگار ہو جاتی ہیں۔ یہ مردِ آہن **ڈاکٹر کنول فیروز** ہیں جو نصف صدی سے معاشرے میں برداشت، رواداری اور بین المذاہب یگانت کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کا واضح موقف بلکہ منشورِ حیات ہی یہ ہے کہ

دین کوئی بھی اختیار کرے
آدمی آدمی سے پیار کرے

نیلسن ڈی کنول المعروف بہ **کنول فیروز** ۴۔اپریل ۱۹۳۸ء کو فیروز پور انڈیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی اعتبار سے پورے علاقے میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ خاص طور پر آپ کے والد ماجد ڈاکٹر سموئیل ڈین میڈیکل کے پیشے سے منسلک تھے اور اپنی مسیحائی کے باعث ہر دلعزیز تھے۔ کنول فیروز نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کی سند امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔ آپ نے کالج آف جرنلزم ایونیوئے یونیورسٹی شکاگو سے کمیونٹی جرنلزم میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے صحافت کو اپنا بنیادی پیشہ بنایا اور ہفت روزہ 'خودی'، روزنامہ 'غریب' لائل پور، ہفت روزہ ''پیام قائد'' سرگودھا اور روزنامہ ''پاکستان'' لاہور سے منسلک رہے اور آج کل لاہور سے اپنا معروف، سماجی، دینی اور ادبی رسالہ 'شاداب' بڑی آب و تاب سے مسلسل شائع کر رہے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انہیں بے شمار اعزازات و انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ وہ عہدِ حاضر میں کرسچن جرنلسٹ ایسوسی ایشن پاکستان کے چیئرمین اور ایسوسی ایشن آف انٹر

ریلیجنس ڈائیلاگ ان پاکستان کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں بطریقِ احسن ادا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کنول فیروز کی درج ذیل تصنیفات و تالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

۱) شہرِ صلیب وگل (شاعری)

۲) شاخِ شبِ وصال (شاعری)

۳) شامِ فراتِ دل (شاعری)

۴) حیاتِ مقدسہ یسوع المسیح (تحقیق)

۵) جمالِ فکر (مسیحی شعراو شاعرات کا تذکرہ)

اس کے علاوہ موصوف نے کئی معروف کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے قابلِ قدر اور لائق صد تحسین ہیں۔

اس کارگہِ دنیا کا بھی عجیب دستور ہے کہ متحرک اشیا و اذہان ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں اور جامد چیزیں جلد یا بدیر بدبودار ہو جاتی ہیں۔ جس طرح ٹھہرا ہوا پانی بدبو دینے لگتا ہے اسی طرح کسی بھی مقام پر رُکا ہوا ذہن بھی بدبودار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کنول فیروز کی شاعری کا سب سے بڑا اور اہم مقصد یہ ہے کہ وہ رجعت پسند اذہان میں حرکت، ارتقا اور ترقی کے امکانات بھر دیں۔ آپ ان کی پوری شاعری کا مطالعہ کر لیجیے وہ ترقی پسندانہ عزائم رکھتے ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ

رجعت پسند ذہن ہیں آمادۂ فساد
بے دانشوں سے تذکرۂ ارتقا نہ کر

ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے وہ معاشرے میں ظلم و تمرد کو کسی بھی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو حقانیت اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے اور یاسیت اور ناامیدی کے ماحول میں چراغ امید

روشن رکھنا چاہیے۔ دراصل کنول فیروز ایک رجائیت پسند شاعر ہیں۔ وہ نہ تو حالات کی یورش سے گھبراتے ہیں اور نہ خود کو سیلِ زمانہ کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ خودغرض معاشرے میں بھی اُمید ورجا کے چراغ جلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک مایوسی اور ناامیدی انسان کو کمتر اور حقیر بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو پیغامِ اُمید دیتے ہیں کہ ۔

اُبھرے گا کسی روز تمناؤں کا سورج

چھٹ جائے گی ماحول کے چہرے کی سیاہی

ڈاکٹر کنول فیروز ایک وسیع القلب اور وسیع المشرب انسان ہیں۔ وہ معاشرے میں محبت، اخوت، بھائی چارے اور دردمندی کو فروغ دینے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں۔ آپ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ فرمالیجیے، آپ دیکھیں گے کہ ان کی شاعری کی بنیادی کلید حرمت انسان اور احترامِ آدمیت ہے۔ وہ دین، عقیدے، مذہب اور مسلک سے ماورا ہوکر معاشرے میں آدمیت اور انسانیت کے فروغ کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان کا اپنا موقف سن لیجیے:

دین و ایمان بھی بجا لیکن

ان میں افضل مگر محبت ہے

ڈاکٹر کنول فیروز کا اسلوب شعر دوسرے ہم عصر شعرا سے منفرد ہے۔ وہ اپنی تراکیب و مرکبات خود وضع کرتے ہیں۔ ان کی تینوں شعری مجموعوں کے نام بھی تازہ مرکبات سے عبارت ہیں۔ ان کے اسلوب میں عقیدے اور عقیدت کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ وہ نئے شعری تلازمات بھی وضع کرتے ہیں اور پرانی تراکیب میں نئے معانی دینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب نہ تو آتش و یاس وشکیب کی طرح بلند آہنگ ہے اور نہ عدم، جگر اور قاسمی کی طرح مدھم۔ وہ ان دونوں کے درمیان کی راہ نکال کر اپنا اسلوب خود وضع کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ آپ ان کے مجموعوں کے درج ذیل

صرف تین اشعار ملاحظہ فرمایئے اور زبان و بیان کے مختلف ذائقوں سے لطف اٹھایئے

؎ سنبھل کے پاؤں اٹھا آبلے نہ پھوٹ پڑیں
کڑی ہے دھوپ کوئی نخلِ سایہ دار نہیں

....

؎ ذہنوں سے تو مٹا دے تعصب کی آیتیں
نام و نسب کو چھوڑ کے انساں سے پیار کر

....

؎ دستک سی ہو رہی ہے سرِ منزلِ خیال
شاید کہ آ گئے ہیں وہ دروازہ کھولیے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہمارے معاشرے میں محبت اور اخوت کی کمی کے باعث ہمارے اندر کی قوت برداشت ختم ہوتی جارہی ہے۔ یہ امر امتنان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر کنول فیروز نے ہمارے بے حس معاشرے میں اپنے افکار و نظریات کے ذریعہ سچائی اور محبت کے فروغ کے لیے اپنے ممکنہ وسائل استعمال کیے ہیں۔ وہ نہ تو معاشرے کی چیرہ دستیوں سے گھبراتے ہیں اور نہ ظلم و تمرد کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ وہ تو جزا و سزا سے بے نیاز ہو کر اہلِ دنیا کو دیوانہ وار یہ پیغام دے رہے ہیں کہ

اپنی صلیب آپ اٹھا کر نکل کنول
حق بات کہہ چکا ہے تو خوفِ سزا نہ کر

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۱۵ نومبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۲۱ مارچ، ۲۴ مارچ ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

•••

'سکوت' کا شور اور نزہت عباسی

عام طور پر ناقدین نے شاعری کو انسانی جذبات کے والہانہ اظہار کا نام دیا ہے۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ شاعر اپنے معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے لہٰذا وہ معاشرے سے مواد اکٹھا کرتا ہے اور اسے اپنے شعور کی بھٹی میں اچھی طرح سے پکاتا ہے اور جذبات کا تڑکا لگا کر اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے۔ میں اس مؤقف سے جزوی اختلاف کرتا ہوں۔ میرا واضح اور دوٹوک مؤقف یہ ہے کہ عظیم شاعری محض جذبات سے وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کے لیے دانش و برہان کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ چھوٹی شاعری محض جذبات کی دین ہوتی ہے اور بڑی اور عظیم شاعری کے لیے علم و دانش کی روایت سے تمسک ضروری ہے۔ میر تقی میر اور غالب کی شاعری کو پُرعظمت بنانے میں ان کی دانشورانہ لیاقت کا خصوصی کردار ہے جبکہ ساحر لودھیانوی اور اختر شیرانی کی شاعری محض جذبات کے برملا اظہار کا نام ہے۔ میرے خیال میں عصرِ حاضر میں وہی شاعری زندہ رہے گی جو علومِ متداولہ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوگی، باقی تمام شاعری گھاس پوس کی طرح اُڑ جائے گی۔

نزہت عباسی دراصل میر و غالب کی اس دانشورانہ روایت سے تعلق رکھتی ہیں جس میں علم و دانش و برہان کو ہر چیز پر تفوق حاصل ہوتا ہے۔ اس روایت سے منسلک ہو کر انہوں نے خود کو دوسری شاعرات کی طرح جذبات کے سمندر میں غرق نہیں ہونے دیا

بلکہ شاعری کو ارفع سطح تک لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ گمان سے یقین تک کا والہانہ سفر ہی نزہت عباسی کی شاعری کا سب سے بڑا وصف ہے۔

اسی خیال میں سارے خیال پنہاں ہیں
اسی یقین میں سارا گمان بھی گم ہے

ایک سوال میرے ذہن میں ہمیشہ گردش کرتا رہتا ہے کہ کیا کوئی عورت اچھی شاعرہ بن سکتی ہے؟؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ ''نہیں''۔ دلیل اس امر کی یہ ہے کہ آج تک کوئی خاتون شاعر میر و غالب سے ہمسری کا دعویٰ کیوں نہیں کر سکی؟؟ میرے خیال میں مردانہ معاشرے میں نسوانی شاعری کو وہ مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جس کی وہ صحیح حقدار ہے۔ کوئی خاتون شاعر اس وقت تک شاعری کے بڑے دھارے میں اپنی شمولیت کا احساس نہیں دلا سکتی جب تک وہ وراثت، روایت اور انفرادیت کی مثلث کو مضبوط نہ کرے۔ نزہت عباسی ایک ایسی شاعرہ ہیں جو شاعری کے جراثیم وراثت میں لے کر طلوع ہوئی ہیں۔ ان کے والد ماجد محمد حسین ظفر انجمی ایک صاحب طرز کلاسیکی شاعر تھے اور ان کی والدہ بھی شعر و ادب کا صحیح ذوق رکھتی تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کے لہو میں شاعری ہو اور جو شاعرانہ آغوش میں تربیت پائے وہ شاعری نہ کرے گی تو کیا کرے گی۔ نزہت عباسی کو جو شعری روایت ملی ہے اس میں حضرت پروفیسر سحر انصاری ان کے ادبی و شعری ملجا و ماویٰ ہیں۔ انہوں نے نزہت عباسی کی ذہنی و فکری تربیت کی اور انہیں علومِ متداولہ سے بہرہ مند ہونے کا سلیقہ عطا کیا۔ اسی طرح پروفیسر عائشہ سعید نے بھی نزہت عباسی کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا۔ معاشرے کی یہ وہ دو ممتاز شخصیات ہیں جنہوں نے نزہت عباسی کی زندگی کی سمتیں تبدیل کر دی ہیں اور وہ خود برملا کہتی ہیں۔

ساری سمتیں بدل کے رکھ دی ہیں

راستہ رہنما کے ہاتھ میں تھا

نزہت عباسی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے محض وراثت اور روایت کی پاسداری نہیں کی بلکہ اپنے لیے انفرادی راستہ تراشا۔ انہوں نے دوسری خواتین کے برعکس مشرقی ومغربی علوم کے غائر مطالعہ کے بعد شاعری کا پہلا مجموعہ ''سکوت'' شائع کرایا۔ اس مجموعے میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو کلاسیکی شعرا کی یاد دلاتے ہیں اور ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو نزہت عباسی کے ذہنی اُپج کے عکاس ہیں۔ نزہت عباسی کے ذہنی اُفق کو وسیع کرنے میں ان کا تدریسی مشغلہ بھی بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ وہ جناح یونیورسٹی برائے خواتین کراچی کی صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے اپنے فرائض بڑی تندہی اور حوصلہ مندی سے ادا کر رہی ہیں۔ شعری ذوق کے حامل والدین، دردمند دل رکھنے والے مہربان احباب واساتذہ اور ذاتی ذوق وشوق نے مل جل کر نزہت عباسی کا شعری منظرنامہ مرتب کیا ہے اور اس کا ثمر ''سکوت'' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نزہت عباسی اپنی شاعری سے نہ تو شہرت کی متمنی ہیں اور نہ صلے کی خواہش مند۔ وہ تو اپنا حال دل بیان کرنے کو اپنا مقصود جانتی ہیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ

اس قدر نہیں آساں، جتنا ہم نے سمجھا تھا

حال دل بتانے میں وقت چاہیے کچھ تو

''سکوت'' نزہت عباسی کا پہلا شعری مجموعہ ضرور ہے لیکن یہ اپنے عمیق موضوعات اور نادر اسلوب کے باعث قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات سکوت وہ کام کر دیتا ہے جو شور، غل اور ہنگاموں سے بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔ اب یہ فیصلہ کرنا تو تخلیق کار کا کام ہے کہ وہ سکوت سے کیا کام لیتا ہے۔ نزہت عباسی نے اس مجموعے کے دیباچے میں دانشورانہ سطح پر کیا

خوب بات لکھی ہے:

''آج ہم جس دور میں زندہ ہیں وہ سائنسی و مشینی دور ہے جس نے فرد کو تنہائی بخشی ہے۔ ذات کا کرب، فرد کی تنہائی، رشتوں کی پامالی اور اقدار کے زوال نے ہزاروں المیوں کو جنم دیا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے زندگی کرنا بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ یہ کائنات جو لامتناہی ہے، اس کی وسعتیں بے کراں ہیں۔ ایک خامشی جو ہر طرف طاری ہے۔ یہی خاموشی یہی تنہائی حساس دلوں پر اُترتی ہے تو درد کے نہ جانے کتنے سلسلے سمٹ آتے ہیں۔ ''سکوت'' بھی فرد کی اسی تنہائی کا فسانہ ہے۔''

یہ بات بلا خوف و تردد کہی جا سکتی ہے کہ سکوت اور خامشی بظاہر تو پرسکون چیزیں ہیں لیکن حقیقت میں اس کے پیچھے سینکڑوں بے قراریاں چھپی ہوتی ہیں اور جب یہ دونوں کلام کرتے ہیں تو معاشرے میں کہرام مچ جاتا ہے۔ شکیب جلالی نے کیا خوب کہا تھا کہ

خموشی بول اُٹھے ہر نظر پیغام ہو جائے
یہ سناٹا اگر حد سے بڑھے کہرام ہو جائے

نزہت عباسی کی شاعری میں فکر و تعمق بھی ہے اور فلسفیانہ موشگافیاں بھی۔ وہ چیزوں اور مسائل کو عام اور سطحی نگاہوں سے دیکھنے کی عادی نہیں ہیں بلکہ وہ عام بات کو بھی خاص بنانے کا ہنر اور سلیقہ جانتی ہیں اور یہی چیز انہیں اپنی ہم عصر شاعرات میں ممتاز مقام دلانے کا سبب بنتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آپ ہی اپنا وجود اس میں ڈبو کر جیسے
اپنی ہستی ہی میں گرداب لیے پھرتا ہے

....

چادر وفا کی اوڑھ لی تربت میں ہو کے خاک
دل تھا صحیفہ، جسم کو جزدان کر گیا

....

لمحہ لمحہ اپنی صورت مٹتی جاتی ہے
خود سے غافل ہوتے رہنا اچھا لگتا ہے

نزہت عباسی کی شاعری میں معاشرتی المیوں کی بے شمار تصاویر جلوہ گر ہیں۔ وہ حالات کی یورش سے کبیدہ خاطر ہیں۔ مہنگائی، سماجی تفاوت، عدم مساوات، ناانصافی، ریاکاری اور غیرت و مفلسی ان کے حساس دل پر کچوکے لگاتی ہیں۔ وہ سماجی مصائب و آلام سے دل گرفتہ ضرور ہیں لیکن مایوس ہرگز نہیں۔ وہ باخبر ہیں کہ ہر غم کے پیچھے مسرت پوشیدہ ہے۔ ان کا یہی رجائی نقطۂ نظر ان کی شاعری میں ایک توانائی اور تروتازگی پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ غم ناک حالات میں بھی کس طرح پرُامید ہیں:

خون میں بہتی یادوں کے ہر قاتل زرّے کا
خار کی صورت چبھتے رہنا اچھا لگتا ہے

....

جب دوا بھی اثر نہ کر پائی
سلسلہ پھر دعا کے ہاتھ میں تھا

....

ڈھل گیا ہے سکوت میں سب کچھ
خامشی بھی رہی نہیں باقی

....

سب خطائیں ان کی ہم بھول بھی تو سکتے ہیں
پر گلے لگانے میں وقت چاہیے کچھ تو

ہر نئی رہ نئی راہوں کا پتا دیتی ہے
مجھ سے رستوں کا اعادہ نہیں ہونے پاتا

....

آسرا ایک پَر کا باقی ہے
حوصلہ تو سفر کا باقی ہے

....

دُکھ سے خوشیاں کشید کرنا ہے
اس طرح ہم کو عید تو کرنا ہے

....

پھر اس کے بعد سبھی منزلیں ہماری تھیں
یہ حوصلہ ہی سفر کا جو رخت ہو جاتا

نزہت عباسی کی شاعری میں حسن و عشق کی دل آویز صورتیں بھی جلوہ گر ہیں۔ ہجر کی تمام کیفیات، آبلہ پائی کی صورتیں، محبوب کی کج ادائیاں، رقیب اور سامراج کی ریشہ دوانیاں، وصل کی لذتیں، محبت کی جدتیں غرض محبت کی جملہ کیفیات ان کی شاعری کا مزاج متعین کر رہی ہیں۔ نزہت عباسی کا اختصاص یہ ہے کہ وہ شاعری میں سطحیت سے عمداً گریز کرتی ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ عشق و محبت کے میدان میں بھی نزہت عباسی عام بات کو بھی خاص انداز میں پیش کرتی ہیں۔

کیسے یہ قربتوں میں رہے اتنے فاصلے
اک شخص آج بھی مجھے جل کر نہیں ملا

....

تمہارے ساتھ وفا کی صداقتیں بھی گئیں
جنونِ عشق کی ساری حکایتیں بھی گئیں

....

وصل کی ہے اب خوشی باقی نہ صدمہ ہجر کا
اب ترا آنا بھی کیا اور اب ترا جانا بھی کیا

....

تیرے غم سے ہو کیوں گریز ہمیں
اک تعلق تو استوار کریں

....

اپنی یادوں کی کہیں پر اک کڑی گم ہو گئی
شہر سب باقی رہا بس وہ گلی گم ہو گئی

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شاعری کے لیے جذبات کے ساتھ ساتھ دانش کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور عظیم شاعری ہمیشہ جذبِ صادق اور دانش و برہان سے وجود میں آتی ہے۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ نزہت عباسی نے اپنی شاعری کو نہ تو محض جذباتی کیفیات کے اظہار کے لیے وقف کیا اور نہ عقل و دانش کی موشگافیوں کو حرزِ جاں بنایا۔ انہوں نے نہایت سلیقے سے جذبے اور دانش کو آمیخت کر کے اپنی شاعری کا منظرنامہ مرتب کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب ان کی شاعری میں ''سکوت'' سے بھی داد و تحسین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

چھایا ہے اک سکوت سا اس کائنات میں
برپا ہے پھر بھی شور یہاں شش جہات میں

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور...... ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

احباب

احباب

- روشنی سے راستہ کشید کرنے والا شاعر۔زاہد شمسی
- ایک معتبر تخلیق کار۔ پروفیسر ظفر چشتی
- تنویر حسین کی تخلیقات میں طربیہ عناصر
- نذیر اے۔قمر کا 'چاند اکیلا ہے'
- ایک ہوش مند تخلیق کار۔ پریا تابیتا
- شفیق الرحمٰن الہ آبادی کا آئینہ خیال
- اسد اعوان کا شعری کارنامہ 'نہ اس طرح سے ملو'
- فدائے اردو۔ سید روح الامین
- اعظم کمال کی رجوعی غزلیں
- لفظوں سے تصویر بنانے والی شبہ طراز
- 'تیرے دیے ہوئے عذاب' اور شاہد چودھری
- وحید عزیز کا شعری کارنامہ 'کوئی فاصلہ نہ ہو'
- اُجلے من کا نقاد۔قدرت اللہ شہزاد
- ایک مہذب شاعرہ۔الویرا یاسمین علی
- حرکت و عمل کا استعارہ۔محمد آصف وٹو

❖❖❖

◆◆◆

روشنی سے راستہ کشید کرنے والا شاعر۔ زاہد شمسی

ملک کی ابتر سیاسی صورتِ حال نے معاشرے کے ہر طبقہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ خاص طور پر شعروادب سے ناتا رکھنے والے تخلیق کار اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر دکھائی دے رہے ہیں۔ پورے معاشرے میں اب کیا ہوگا؟؟؟ کے خدشات جنم لے رہے ہیں اور پوری قوم بے سمت سفر کر رہی ہے۔ تخلیق کار واضح حکمت عملی سے محروم ہیں۔ دانش مند تخلیق کار خاموش ہیں اور کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ سیاست کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ اگر تذبذب کی یہ صورتِ حال چند ماہ مزید جاری رہی تو پوری قوم فکری انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ اس ابتر صورتِ حال میں ادیبوں اور شاعروں کے لیے لازم ہے کہ وہ قوم کو حق وصداقت کی راہ دکھائیں اور اپنے افکار ونظریات کے ذریعے پوری قوم کو امید ورجا کا پیغام دیں۔ عصرِ حاضر میں جو شعرا احسن طریقے سے یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں ان میں ایک معتبر شاعر **زاھد شمسی** بھی ہیں جو اس گئے گزرے زمانے میں بھی چراغِ اُمید جلائے بیٹھے ہیں اور اُنہیں یقین ہے کہ آنے والا وقت خوش کُن اور خوش گوار ہوگا۔ اُن کی یہی رجائیت انہیں ہم عصر شعرا میں منفرد اور ممتاز مقام دلانے کا باعث ہے۔

اب بھی قائم ہے زمانے میں نظامِ ہستی

اُس کی دنیا میں ابھی صدق وصفا باقی ہے

عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ سائنس کی برق رفتار ترقی سے کماحقہ' استفادہ کی کاوش ہی نہیں کرتے۔ اس طرح ان کے اذہان سطحی مسائل و موضوعات کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کا اسپِ قلم عالم گیر میدان میں دوڑنے سے گریزاں دکھائی دیتا ہے۔ اس المناک صورت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جلبِ منفعت کا شکار ہو کر ذاتی اور سطحی مسائل میں اُلجھ کر برباد ہو جاتے ہیں۔ جب تک ہمارے تخلیق کار بین الاقوامی تناظر میں اپنے ذہنی اُفق کو وسیع نہیں کریں گے ان کی تخلیقات آفاقی قدروں کی حامل قرار نہیں پائیں گی۔ آج کے تخلیق کار کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ جلد از جلد شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند مقام پر متمکن تو ہونا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے جس جدوجہد، محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے کوسوں دور ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تخلیق کاروں کے لیے ایسا پُرسکون ماحول فراہم کریں کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کریں اور عالمی ادب میں اپنا مرتبہ منوا سکیں۔ زاہد شمسی اپنی مسلسل محنت اور شعری مشاقی سے اس کوشش میں مگن ہیں کہ وہ عالمی سطح پر کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکیں۔ انہیں یقین کامل ہے کہ ان کی شعری کاوشوں کا نتیجہ باثمر ہوگا۔

پتھروں کے راستے پر جو سفر کرتے رہے
ایک دن زاہد وہی انمول موتی ہو گئے

عصرِ حاضر کی برق رفتار سائنسی ترقی نے ایک جانب تو ہمیں نئی دنیا سے روشناس کرا دیا ہے اور دوسری جانب ہمیں بعض اخلاقی عوارض لاحق ہو گئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے تو اخلاقی روایات میں پرورش پائی تھی لہٰذا ان میں کچھ نہ کچھ مثبت اخلاقی اقدار کے اثرات موجود ہیں لیکن عہدِ جدید کے نوجوانوں کا حال انتہائی ابتر ہے۔ وہ چیزوں کو سطحی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں اور بزرگوں کی روایات کو "طرزِ کہن" قرار دے دیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پورے معاشرے کا اخلاقی نظام تباہ و

برباد ہو گیا ہے۔ ہماہمی کا عالم ہے۔ سیاست ہو یا معیشت، مذہب ہو یا ادب ہر شعبۂ حیات روبہ زوال ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو اخلاقی جادے سے ہٹانے والے تو سینکڑوں ہیں لیکن انہیں راہِ راست پر لانے والے رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ زاہد شمسی بھی اس صورت حال سے بے حد کبیدہ خاطر ہیں۔ وہ معاشرے کو تخلیق کار کی حساس نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ منفی اقدار کی بیخ کنی کیلئے ہر طریقہ اور وسیلہ اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہر طرف نفرت ہی نفرت موجزن دکھائی دے رہی ہے وہ محبت، اخوت اور دوستی کے پرچارک ہیں۔ زاہد شمسی کا یہ منشورِ حیات سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

آؤ اُلفت کا راستہ ڈھونڈیں

اب تو نفرت نے انتہا کی ہے

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان زاہد شمسی کی جلائی ہوئی شمعِ محبت سے استفادہ کریں اور اُس کی روشنی سے اپنی راہِ حیات متعین کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح ہمارے بزرگوں کو بھی چاہیے کہ وہ محض اپنی کہنہ روایات کو سینے سے نہ لگائے رکھیں بلکہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات کو محسوس کریں اور نوجوانوں کی تربیت کیلئے اپنے وقیع تجربات کو بروئے کار لائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے افکار و نظریات کو بین الاقوامی سطح سے ہمکنار نہیں کریں گے وہ چشمِ معنی آشنا میں اپنی جگہ نہیں بنا سکیں گے۔ جدید دور میں وہی ادب اور نظریہ زود اثر اور دیرپا کہلائے گا جس میں بین الاقوامی سطح پر متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی۔ تمام پاکستانی تخلیق کاروں کا اولین فریضہ ہے کہ وہ ذاتی رنجشوں کو فراموش کر کے عالمگیر معاملات پر اپنی توجہ کو مبذول کریں تا کہ اُن کی تخلیقات پوری دنیا کو متاثر کر سکیں۔

یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ زاہد شمسی نے اپنی ذات اور اپنی شاعری کو آفاقی قدروں کی تزئین و آرائش کے لیے وقف کر دیا ہے۔ تمام معروف ناقدین اس امر

پر متفق ہیں کہ وراثت، روایت اور انفرادیت کے باعث تخلیق کار عظمتوں سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ زاہد شمسی کا اختصاص یہ ہے کہ وہ ایک علمی اور ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور شاعری ان کے لہو میں گردش کر رہی ہے۔ وہ شعری روایت سے کماحقہٗ آگاہ ہیں اور بدلتے ہوئے رجحانات و نظریات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں قبول کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ وراثت اور روایت کے علمبردار ہونے کے باوجود انفرادیت کے قائل ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ شعروادب کو جدید تناظر کا حامل ہونا چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ آپ ان کے مجموعۂ کلام ''درد ایک روشنی ایک راستہ'' کا مطالعہ فرمالیجئے آپ کو اس میں کلاسیکی روایت کی پاسداری بھی ملے گی تاہم جدید رجحانات اس مجموعہ کا امتیازی وصف قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ اس کتاب میں ان کا دیباچہ مطالعہ فرمالیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ زاہد شمسی نے تعمق اور بلند فکری کے ساتھ درد کو ایک حساس میزان قرار دیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ درد و غم کی کیفیات سے گزرنے والے انسان کو ایک ایسی روشنی عطا ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے اسرارِ کائنات منکشف کر دیتی ہے اور انسان حق و صداقت کے کشادہ راستوں پر نہایت تمکنت سے رواں دواں ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ درد، روشنی اور راستہ زاہد شمسی کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں اور ان کا شعری منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔

زاہد شمسی نے اس مجموعے میں حمد، نعت، سلام، منقبت، قطعات، منظومات، متفرقات اور غزلوں کو شامل کیا ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ ان کے افکار و نظریات جانچنے کا بہترین ذریعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل حمدیں، مناقب، سلام اور نعتیں زاہد شمسی کی دینی حساسیت پر دلالت کرتی ہیں جبکہ ان کی نظمیں اور غزلیں ان کی شاعرانہ اپج کی غماز ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں کلاسیکیت اور جدت کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ انہوں نے نہ تو محض کلاسیکی رنگ کو من و عن اپنی غزل کا غازہ بنایا ہے اور نہ

جدّت کی بیساکھی پر شاعری کے دشوار گزار راستے کو عبور کرنے کی کاوش کی ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جدت ہمیشہ کلاسیکیت کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری اور خصوصاً غزل کو بے راہ رو جدّت کی نذر نہیں ہونے دیا۔ آپ ان کی غزلوں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے، آپ دیکھیں گے کہ ان میں بعض اشعار ہمارے کلاسیکی اساتذہ کی یاد دلاتے ہیں۔ زاہد شمسی کی غزلوں میں معاشرے کی بے حسی، بے بضاعتی، کج روی اور غلط بخشی پر طنز موجود ہے۔ وہ عصرِ حاضر کے پریشاں حال اور افسردہ انسان سے اظہارِ ملال بھی کرتے ہیں اور اسے عزم و حوصلہ بھی بخشتے ہیں۔ وہ جدّت کے شوق میں منزل کھو بیٹھنے والوں کو راہِ تحقیق بھی دکھاتے ہیں اور طرزِ کہن پر اڑنے والوں کو جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زاہد شمسی ایک پاک باطن اور نیک سیرت شاعر ہیں اور ان کی دیرینہ حسرت ہے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرے کی سمت نمائی کریں۔ اس سوچ میں وہ کہاں تک کامگار ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو قارئین فرمائیں گے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اگر اس ابتر سیاسی وسماجی صورتِ حال میں ادیبوں اور شاعروں نے قوم کے سامنے چراغِ اُمید روشن نہ کیا تو یہ قوم بے سمت ہو جائے گی۔ زاہد شمسی کا یہ مجموعہ ''درد ایک روشنی۔ ایک راستہ'' اس منتشر قوم کے لیے روشنی بھی ہے اور راستہ بھی۔ وہ امید و رجا کا چراغ جلائے ہر صاحبِ بصیرت کے دل پر دستک دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں

اس کے خیمے میں ابھی ایک دیا باقی ہے
کتنا طوفاں ہے مگر ایک ضیا باقی ہے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۴راگست ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۱۶جولائی ،۲راگست ۲۰۰۸ء۔۳۰جنوری ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

ایک معتبر تخلیق کار۔ پروفیسر ظفر چشتی

اس چمک دمک کی دنیا میں ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مختلف منفی ومثبت ذرائع استعمال کر کے اوجِ ثریا تک پہنچ جائے۔ کوئی شہرت کا دیوانہ ہوتا ہے اور کوئی دولت کا متوالا۔ کسی کو دنیاوی عزت درکار ہوتی ہے اور کوئی جاہ واقتدار کا بھوکا نظر آتا ہے۔ یہ تمام لوازمات حاصل ہو جانے کے بعد بھی ایسے انسانوں کی ہوس ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس قبیل کے لوگ شکستِ یقیں سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ان کا مطمحِ نظر صرف اور صرف ذاتی مفاد اور دنیا کی طمع تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور جب وہ دنیاوی حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں تو وقت گزر چکا ہوتا ہے اور وہ زبانِ بے زبانی سے اہلِ دنیا کو یہ پیغام دیتے ہیں ؎

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اسی رنگ وآہنگ کی دنیا میں کچھ ایسے نفوس بھی سانس لے رہے ہیں جو دنیاوی حرص وآز سے خود کو بچائے ہوئے ہیں۔ اپنی آنکھوں میں سرمۂ خاکِ مدینہ ونجف سجائے یہ پاک باطن افراد دنیا کی خیرہ کر دینے والی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ ان کی فقیری پر بادشاہی کو رشک آتا ہے۔ انہیں دنیاوی شہرت، عزت، دولت، عظمت، سطوت اور طاقت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ دوسروں کے فرقِ ناز پر رکھے تاج کی نسبت اپنے دوش پر رکھی گلیم پر فخر کرتے ہیں۔

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے مرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تری داستاں بھی عظیم ہے مری داستاں بھی عظیم ہے

داتا کی اس نگری لاہور میں ایک ایسا درویش منش انسان بھی موجود ہے جو سر جھکائے اپنے کام میں مصروف ہے۔ عاجزی اس کے خمیر میں موجود ہے مگر عزتِ نفس کی خاطر بڑے بڑے کجکلاہوں سے ٹکرا جانا اس کا وصف خاص ہے۔ اس فرد فرید کا نام نامی اسمِ گرامی **ظفرالحق چشتی** ہے جو اپنے اجداد کی عظیم ترین روایات کا علمبر دار ہے۔

ظفرالحق چشتی ۱۹۵۶ء میں معروف صوفی بزرگ حضرت محمد ریاض الحق قریشی کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نیک اور خدا ترس انسان تھے اور ساری زندگی مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے رہے۔ وہ رسولؐ کے عاشق صادق تھے اور ہمیشہ ۱۲ ربیع الاول کو اپنے دولت کدے پر ایک پروقار اور نورانی محفل نعت سجایا کرتے تھے جس میں ملک کے معروف نعت خواں اور شعرا بارگاہِ نبویؐ میں اپنے جذبات کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ ظفرالحق چشتی نے ابتدائی تعلیم چشتیہ ہائی سکول لاہور سے حاصل کی۔ یہاں انہیں خواجہ صادق حسن، عارف عبدالمتین اور حسن بخت جیسے جید اساتذہ سے اکتساب کرنے کا موقع ملا۔ ایف۔ اے کے لیے ظفر چشتی نے ماڈل کالج ماڈل ٹاؤن لاہور کا انتخاب کیا۔ یہاں انہیں پروفیسر خورشید الحسن اور پروفیسر سید عطا محمد نقوی جیسے اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی۔ انہوں نے بی۔ اے اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے کیا اور ڈاکٹر احراز نقوی، پروفیسر ارشاد الحسن، پروفیسر شہرت بخاری اور پروفیسر عبدالحیٔ صدیقی جیسے اساتذہ کے فیوض و برکات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اُردو کرنے کے بعد سلیکشن بورڈ برائے تقرری اساتذہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گئے۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ دیال سنگھ کالج میں پڑھانے کے بعد آج کل اسلامیہ کالج سول لائنز میں پوسٹ گریجوایٹ شعبۂ اُردو کے صدر کے فرائض بڑے حسن وخوبی سے ادا فرما رہے ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے

''محمد حسین عرشی۔ علمی وادبی خدمات'' کے عنوان سے تحقیقی وتنقیدی مقالہ لکھ کر ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی اور آج کل پنجاب یونیورسٹی سے ''اُردو غزل کے مابعد الطبیعیاتی عناصر'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ پروفیسر ظفر الحق چشتی کے پچاس سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی مضامین مختلف علمی وادبی جرائد میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کی نعتوں، سلاموں اور غزلوں کے تین علیحدہ مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ وہ تقریباً پانچ برس سے ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور میں ادبی جائزہ نگاری کا فریضہ بڑی ذہانت اور ادبی دیانت سے ادا کر رہے ہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔

پروفیسر ظفر الحق چشتی کی علمی وادبی جہتوں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا) ایک ہمہ رنگ شاعر

ب) ایک معتبر محقق اور نقاد

ج) ایک مستند جائزہ نگار

اب ذیل میں ان تینوں رُخوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

ظفر الحق چشتی کی شاعری کا کثیر حصہ حضور اکرمؐ اور ان کی آلِ اطہارؑ سے والہانہ عقیدت پر مشتمل ہے۔ وہ ان عفت مآب ہستیوں کی شان میں روایتی موضوعات ومضامین پیش کرنے کے بجائے منفرد خیالات اُجاگر کرتے ہیں۔ ان کی عقیدت بھری شاعری میں مذہب سے والہانہ شیفتگی بھی ملتی ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لیے مفید اور کارآمد تجاویز بھی۔ وہ اتحاد بین المسلمین کے داعی ہیں۔ ان کے سلام کے صرف دو اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ کس طرح حق اور سچ کے فروغ کے لیے مستعد ہیں ۔

اُنؑ کی تطہیر کے فرمان میں کیا جھگڑا ہے
یہ تو قرآن ہے قرآن میں کیا جھگڑا ہے
شیوۂ اہلِ محبت پہ لڑائی کیسی
مسلکِ بوذرؓ و سلمانؓ میں کیا جھگڑا ہے

ظفر الحق کی غزلیں بھی عامیانہ موضوعات سے تہی ہیں۔ وہ حسن وعشق کا ارفع تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں تصوف اور مابعد الطبیعیاتی عناصر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ شعر سادہ اور عام فہم ہوتا ہے اور اسی باعث سامعین وقارئین کے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ ظفر چشتی کا خوبصورت لحن اس پر مستزاد ہے۔ ان کی غزل کے صرف دو اشعار دیکھیے

سرِ تعمیر ان باتوں کا بھی اندازہ رکھنا تھا
جہاں دیوار کھینچی ہے وہاں دروازہ رکھنا تھا
خزاں کے موسموں میں اُس کی محنت بڑھ گئی ہوگی
کہ عاشق کو گلِ زخمِ جگر بھی تازہ رکھنا تھا

ظفر الحق ایک صاحبِ بصیرت نقاد اور عمیق نگاہ محقق ہیں۔ ان کے نظری و عملی مضامین ان کی صناعانہ صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔ وہ موضوع کے انتخاب سے لے کر تکمیل تک ہر حصے کو گہری بصیرت سے دیکھتے ہیں اور اپنے واضح نقطۂ نظر کی بدولت اس کا محاکمہ کرتے ہیں۔ ان کی علمیت اور دیدہ وری کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کے تمام مضامین ان کے ترقی پسندانہ نظریات کے حامل ہیں اور ان کی تنقیدی دیانت کے گواہ ہیں۔

اُردو تنقید میں ایسے ناقدین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات میں ذاتی نمود و نمائش سے گریز کرتے ہوئے حقیقی تنقیدی معیارات کو پیشِ نگاہ رکھا ہو۔ پروفیسر محمد ظفر الحق چشتی ان چنیدہ ناقدین میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی تنقید کو ذاتی مخاصمت کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ آپ ان کی تحریروں کا مطالعہ فرمائیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ انہوں نے ہمیشہ حق اور سچ کو پیشِ نگاہ رکھا ہے اور یہی وہ صفت ہے جو انہیں ہم عصر ناقدین میں ممتاز مقام دلانے کی موجب ہے۔

اُردو میں **ادبی جائزہ نگاری** کی روایت کو مستحکم کرنے میں ماہنامہ شام و سحر لاہور کا کردار اساسی رہا ہے۔ ملک کے معروف جائزہ نگاروں نے اپنے تنقیدی افکار

سے اس جریدے کے صفحات کو تابانی عطا کی ہے۔ ماہنامہ شام وسحر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ پروفیسر ظفر چشتی کئی برسوں سے اس جریدے کی تخلیقات کا بے لاگ تجزیہ کررہے ہیں۔ ان کے تجزیوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ہر تخلیق کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرماتے ہیں اور پھر اُردو ادب کے سیاق وسباق کی روشنی میں اس کا محاکمہ کرتے ہیں۔ ان کی شعوری کوشش ہوتی ہے کہ احباب کے دلوں کو ٹھیس نہ لگے۔ یہی سبب ہے کہ بعض مقامات پر وہ سخت اور ترش الفاظ استعمال کرنے کے بجائے ناصحانہ اور مشفقانہ انداز اپناتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دوسروں کی پگڑیاں اُچھالنے کے بجائے ان کی دستار بندی کے قائل ہیں۔ ان کی تجزیہ نگاری کی یہ صفت لائق صد تحسین بھی ہے اور قابل قدر بھی۔ یہی سبب ہے کہ شام وسحر کے قارئین اور تخلیق کار محمد ظفر الحق چشتی کے اس ادبی جائزہ کو پسند بھی کرتے ہیں اور اس تجزیہ کو پیشِ نگاہ رکھ کر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس دنیا میں بعض نیک نفس افراد خلوص نیت سے علم وادب کی ترویج میں مصروفِ عمل ہیں۔ ظفر چشتی دنیاوی شہرت وعظمت کے ہرگز طلب گار نہیں ہیں اور شاید اسی احساس کے باعث انہیں علم وادب کی دنیا میں جو عزت وشہرت نصیب ہوئی ہے اس کی حسرت لیے بہت سے تخلیق کار اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر ظفر چشتی کی ناقدانہ بصیرت وبصارت میں اضافہ فرمائے تاکہ وہ اپنے قلم سے اسی طرح حق وصداقت کی روشنی بکھیرتے رہیں۔

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۱۶ر فروری ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۷ جنوری ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

تنویرِ حسین کی تخلیقات میں طربیہ عناصر

عصرِ حاضر میں دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ہر شخص پریشاں حال اور مضطرب دکھائی دیتا ہے جو افراد غمِ دوراں کا شکار نہیں ہوتے انہیں غمِ جاناں مار ڈالتا ہے۔ اس غمگین صورتِ حال میں ہمارے معاشرے کا ہر فرد چڑچڑا ہوتا جا رہا ہے۔ دوسروں سے گریزاں انسان اب اپنے آپ سے بھی نالاں نظر آ رہا ہے۔ بقول سجاد باقر رضوی ؎

یہ دھوپ چھاؤں ہے دنیا کی، خود مرا سایا
مرے قریب سے گزرا ہے اجنبی کی طرح

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم معاشرے سے کھو جانے والی اخلاقی قدروں، مثبت سماجی رویوں اور معاشی آسودگی کا رونا تو روتے ہیں لیکن ہماری زندگی سے غائب ہو جانے والے طربیہ عناصر کا ہمیں احساس تک نہیں ہے۔ کاش ہمیں اپنے سماج سے روٹھ جانے والی اس مسرت و شادمانی کو واپس لانے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ آپ یقین جانیے بعض اوقات ایک لمحہ کی خوشی پوری زندگی کا حاصل بن جاتی ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی:

بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے — غنچے تری بے کسی پہ دل ہلتا ہے
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے — غنچے نے کہا اس چمن میں اے بابا

آیئے غور و فکر کے آئینے میں دیکھتے ہیں کہ ہم سے ہماری ہنسی چھیننے والے کون لوگ ہیں؟؟ کیا ہم اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کر کے مسرت و شادمانی کے ذریعہ اپنے وطن کو

رشکِ بہشت بنا سکتے ہیں؟؟ اگر ایک شاعر محبوب کے رخسار کے تل پر سمر قند و بخارا نچھاور کر سکتا ہے تو ہم کسی دوسرے کی ایک خوشگوار مسکراہٹ کے لیے اپنی زندگی کیوں نہیں قربان کر سکتے۔ اقبال عظیم نے کیا خوب کہا تھا کہ :

آنکھوں سے نور دل سے خوشی چھین لی گئی — ہم سے ہماری زندہ دلی چھین لی گئی
اک روز اتفاق سے ہم مسکرائے تھے — اس کی سزا میں ہم سے ہنسی چھین لی گئی

اس غمگین و غم زدہ ماحول میں وہ افراد قابل تکریم ہیں جو دوسروں کے لبوں پر مسکان بکھیر رہے ہیں۔ خاص طور پر ایسے تخلیق کار قابلِ صد تحسین ہیں جو معاشرتی آشوب کو خود تو برداشت کر لیتے ہیں لیکن اپنی تخلیقات کو غم والم سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ وہ نہایت محبت سے طربیہ عناصر کے چراغ روشن کرتے ہیں اور معاشرے کو خوشگوار ماحول عطا کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آج کے دور میں دوسروں کو مسرّت عطا کرنا بے حد ''مشکل'' ہو گیا ہے مگر **تنویر حسین** یہ کام ''آسانی'' سے انجام دے رہے ہیں اور ان کا قلم بیس برس سے طنز و مزاح کے خوبصورت پھول کشید کرنے میں مصروف ہے اور اس طرح وہ معاشرے میں ''باطنی خوشیاں'' بکھیرنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اپنے خونِ دل سے جو چراغِ مسرّت روشن کیا ہے، معاشرے کے غم والم کی تند و تیز ہوائیں بھی اسے بجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔

سیّد تنویر حسین کنگرہ، تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سیّد شمشاد حسین شاہ ایک صوفی منش اور دیندار انسان تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور انہیں دین سے لگاؤ اور وطن سے محبت کی تلقین کی۔ وہ خود تو قضائے الٰہی سے وفات پا گئے لیکن ان کی صالح اولاد آج بھی ان کے بتائے ہوئے راستے پر رواں دواں ہے۔ تنویر حسین نے ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے انگریزی اور اُردو کی

اسناد امتیازی حیثیت سے حاصل کیں۔ انہوں نے گورنمنٹ ڈگری کالج ڈسکہ سے بطور لیکچرر اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور آج کل گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں اپنے تدریسی فرائض انتہائی محنت اور تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ربع صدی کو محیط ہے۔ انہوں نے لکھنے کا آغاز تو زمانۂ طالب علمی ہی سے کر دیا تھا مگر ان کے تخلیقی جوہر تدریس کے شعبہ سے منسلک ہونے کے بعد کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سفر آج بھی اسی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔

تنویر حسین کی طنز و مزاح سے بھرپور تین کتابیں ''شاباش''، ''مزاج بخیر'' اور ''خوش آمدید'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اسی طرح معروف افسانہ نگار غلام عباس کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تنویر حسین کی تالیف 'غلام عباس۔ فکر و فن کے آئینے میں' شائع ہو چکی ہے۔ ''اصنافِ ادبِ اردو'' نامی کتاب میں تنویر حسین نے اہم اصناف کا محاکمہ کیا ہے۔ انہوں نے برنارڈ شا کے ڈرامے کا ترجمہ ''سیزر اور قلوپطرہ'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے۔ یہ تمام کتابیں اپنی نوعیت کے حوالے سے اہم ہیں تاہم طنز و مزاح کے حوالے سے اُن کی تینوں کتابیں انتہائی اہم ہیں اور آج ہمیں ان کے متعلق چند معروضات پیش کرنا ہیں۔

دانش مندوں نے مزاح پیدا کرنے کے درج ذیل تین طریقے بیان کیے ہیں:

الف) لفظوں سے مزاح پیدا کرنا ب) واقعات سے مزاح پیدا کرنا

ج) صورتِ حال سے مزاح پیدا کرنا

تنویر حسین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ان تینوں طریقوں سے تو مزاح تخلیق کر ہی رہے ہیں، ان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ ''سنجیدگی'' سے مزاح تخلیق کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک ''سنجیدہ مزاح'' تخلیق کرنا سب سے دشوار ہے۔ اس کے لیے علم

اور ریاضت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خود اپنی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''______

''ہمارا مشاہدہ ہے کہ کتابیں یا تو پبلشر لکھواتے ہیں یا بیویاں لیکن مصنفین کے بارے میں دونوں کی رائے اچھی نہیں۔ پبلشروں کے نزدیک کتاب لکھنا بہت ہی آسان، اس کا چھپنا اس سے بھی آسان اور اس کا بیچنا سب سے مشکل ہے۔ اسی طرح بیوی کے نزدیک وہ کام، جس میں مالی منفعت کا دور دور تک کوئی امکان نہ ہو، بیکاری کی زد میں آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان میں سے کسی مخلوق نے بھی کتاب لکھنے پر نہیں اُکسایا۔''

______''

(تنویر حسین شاباش لاہور: شفیق پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۹)

تنویر حسین کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے مزاح اور طنز کو کسی خاص موضوع یا اسلوب کا پابند نہیں ہونے دیا۔ آپ کو ان کی تحریریں پڑھ کر کشادگی کا احساس ہوتا ہے مثلاً آپ ان کے مضامین ''مارکس ازم''، ''نکاح بندی''، ''نثری نظم اور طوطا''، ''داخلوں کا موسم''، ''ولیمہ دنگل''، ''لاہوری ناشتے''، ''رکشہ۔ قابلِ رشک سواری''، ''تعلیمی تجربے''، ''پنجابی فلمیں''، ''بے چاری دیواریں''، ''غالب کلاس روم میں''، ''سیر لنڈے کی'' وغیرہ کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمایئے تو آپ کو فوراً احساس ہو جائے گا کہ تنویر حسین کسی خاص موضوع میں بند نہیں ہیں۔ ان کا یہ موضوعاتی تنوع دراصل ان کے عمیق مشاہدے کی دین ہے۔ وہ زندگی کے روزمرہ کے معمولات کو ہماری طرح اپنی دو آنکھوں سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ان کی تخلیق کی تیسری آنکھ زیادہ ہوشیار ہے۔ عام چیزوں کو تخلیق کار کی تیسری آنکھ ''خاص چیز'' بنا دیتی ہے۔ تنویر حسین ہر چیز کو نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے قارئین بھی ان تمام

چیزوں کو ان کی سطح پر بلند ہو کر دیکھیں۔ یہ ایک ایسا ہنر ہے جس سے ہمارے عہد کے اکثر تخلیق کار تہی ہیں۔ آپ تنویر حسین کے مضامین ''انکل آف روڈ''، ''بس اور بے بسی''، ''ہمارے لباس''، ''نصیحتیں''، گھوڑے، گدھے اور انسان''، ''سرکاری اور غیر سرکاری نلکے''، ''طوفانی مالش''، ''فارغ البالی''، ''ٹھنڈا یا گرم''، ''دو نمبر ہیرو'' وغیرہ کا مطالعہ فرما لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان مضامین میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو ہم میں اور ہمارے معاشرے میں موجود ہیں لیکن ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ تنویر حسین کا سب سے بڑا کمال ہی یہ ہے کہ وہ دل کی بینائی سے چیزوں کو اٹھا کر ہمارے قلب و اذہان میں منتقل کر دیتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان چیزوں سے ہم بھی لطف اٹھانے لگتے ہیں۔

تنویر حسین کی طنز و مزاح نگاری کے مدوحین میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، زبیر احمد، عطاالحق قاسمی، بشریٰ رحمٰن، سید ضمیر جعفری اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے اکابرین شامل ہیں۔ یہ تمام مبصرین اس بات پر متفق ہیں کہ تنویر حسین کے فکاہیہ مضامین اپنے موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ یہاں میں صرف ایک بات کا اضافہ کر کے اجازت چاہتا ہوں کہ اگر ہم اپنی ''گمشدہ ہستی'' کی بازیافت چاہتے ہیں تو ہمیں پھکڑ باز مسخروں سے نجات حاصل کر کے سنجیدہ فکر مزاح نگاروں سے تعلق خاطر جوڑنا چاہیے اور بلاشبہ تنویر حسین کی فکاہیہ تحریریں ہمارے لبوں کی گم شدہ مسکراہٹ واپس دلا سکتی ہیں۔

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۱۰ اکتوبر، ۱۹ مئی ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور......۹ جولائی ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

نذیر۔اے۔قمر کے ماہیوں کا مجموعہ 'چاندا کیلا ہے'

ایک سوال ادبی وشعری دنیا کے ناقدین کے مابین ہمیشہ باعثِ نزاع رہا ہے کہ عظیم شاعری الفاظ سے پیدا ہوتی ہے یا اعلیٰ خیالات سے جنم لیتی ہے......؟؟ اس سوال سے قطع نظر میرا موٴقف یہ ہے کہ بڑی اور عظیم شاعری ہمیشہ ''کومٹ منٹ'' سے پیدا ہوتی ہے۔ ارفع خیالات اور مناسب الفاظ سے شاعری تو وجود میں آ سکتی ہے تاہم عظیم شاعری ہرگز طلوع نہیں ہو سکتی۔ آپ دنیا کی عظیم شاعری کا مطالعہ فرمالیجیے آپ خود دیکھیں گے کہ چشمِ معنی آشنا میں وہی شاعری جگہ پائے گی جو اعلیٰ و ارفع مقاصد سے مالا مال ہوگی۔ ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے تخلیق کار انفرادیت کے چکر میں پڑ کر یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کی شہرت وعظمت کا مدار اعلیٰ و ارفع مقاصد کی پیش کش پر ہے، انفرادیت پر ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ جو شعرا اس نکتہ پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں وہ ایوان شاعری میں بلند مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ **نذیر۔ اے۔ قمر** ان چنیدہ شعرا میں شامل ہیں جن کی شاعری لفظی اُلٹ پھیر کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی سنجیدگی سے معاشرے کی تبدیلی کے خواہاں ہیں اور ان کا واضح موقف یہ ہے کہ معاشرے کی مذموم رسوم کی بیخ کنی کے لیے شعروادب کو وسیلہ بلکہ موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ عمیق نگاہی سے ان کے شعری مجموعوں کا مطالعہ فرمالیجیے تو

آپ کو ان کا یہ واضح پیغام مل جائے گا کہ ''بہار آنے تک'' چاند اکیلا ہے۔'' اگر آپ چاہتے ہیں کہ کامیابی کا چاند اپنے ساتھیوں کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر ہو تو آپ معاشرے سے خزاؤں کے خاتمے کا اہتمام کیجیے۔ نذیر اے قمر کی شاعری کا یہی مرکزی نقطہ ہے اور ہمیں اسی حوالے سے ان کی کُل شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نذیر۔ اے۔ قمر ربع صدی سے شعر و ادب کے ایوان کو اپنے زرّیں افکار و نظریات سے سجا رہے ہیں۔ ان کی صناعانہ کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے اور ہر صاحبِ دل کو خبر ہے کہ ان کی شاعری میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ وہ سطحی اور عامیانہ باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری اور خصوصاً ماہیوں میں سوچ اور فکر کی گہرائیاں ہویدا ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل صرف تین ماہیے ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ نذیر اے قمر کی شاعری میں معنی کی کتنی سطحیں پوشیدہ ہیں۔

اشکوں کی کہانی کا	بس نام کے میلے ہیں	پلکوں کو بھگوتے ہیں
اب راز نہ کھل جائے	انسانوں کی دھرتی میں	جو سامنے ہنستے ہوں
دریا کی روانی کا	انسان اکیلے ہیں	وہ بعد میں روتے ہیں

یہ بات عام مشاہدے کی ہے کہ صرف وہی درخت چھتنا ور بن پاتے ہیں جن کی جڑیں زمین میں گہری پیوست ہوتی ہیں۔ اس راز سے آگاہ ہو جانے کے بعد نذیر۔ اے۔ قمر نے اپنی شعری روایات سے گہرا ربط قائم کر رکھا ہے۔ وہ پردیس میں رہ کر بھی اپنی دیس کی سہانی اور مہک دار مٹی سے محبت کرتے ہیں اور یہاں کی جملہ روایات کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ آپ ان کے اُردو ماہیوں کے تازہ ترین مجموعے ''چاند اکیلا ہے'' کا مطالعہ فرمالیجیے آپ دیکھیں گے کہ اس مجموعے میں وطن سے والہانہ محبت کے مظاہر جلوہ گر ہیں۔ وہ اپنے وطن کی زمین، آسمان، چاند، ستارے، پہاڑ، صحرا، جنگل، دریا غرض ہر چیز سے محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان

کرنے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل ماہیے ملاحظہ فرمائیے اور اس میں وطن سے محبت کی سوندھی سوندھی مہک محسوس کیجیے۔

پانی کی پھواریں ہیں | خدشات نہیں رکھنا | دو رنگوں کی کلیاں ہیں
اسپین کے ساحل پر | میں لوٹ کے آؤں گا | اسپین سے بھی اچھی
یادوں کی قطاریں ہیں | تم میرا یقیں رکھنا | ترے گاؤں کی گلیاں ہیں

نذیر۔ اے۔ قمر کے ماہیوں میں خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں حیرت انگیز نکات پوشیدہ ہیں، جنہیں صاحبانِ بصیرت ہی دریافت کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نذیر۔ اے قمر کی شاعری کا عموماً اور ماہیوں کا خصوصاً عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا جائے تاکہ اس کے جملہ اسرار کھل کر ہمارے سامنے آ سکیں۔ اب تو یہ بات بلاشک و بلاتردد کہی جا سکتی ہے کہ ایک معتبر شاعر اپنی شاعری کو خدا، انسان اور کائنات کی مثلث سے مزّین کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے اور اس مثلث کے تینوں سروں کو ایک دوسرے سے پیوست کرنے کی مشکور سعی کرتا ہے۔ نذیر۔ اے قمر کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ماہیوں میں جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت و سطوت بیان کی ہے وہاں دوسری جانب انسان کی بے پایاں خدمات پر روشنی ڈالی ہے اور کائنات کے سربستہ رازوں کو کھولنے کی تدابیر بیان کی ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل ماہیوں کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے خدا، انسان اور کائنات کی مثلث کو کتنے سلیقے سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

مت پوچھ خدا کیا ہے | خالق کو مناتا ہوں | دو رنگوں کا پیار ملا
ہر چیز پہ لکھا ہے | دربارِ الٰہی میں | دنیا کے فسانے کا
خالق کے سوا کیا ہے | جب سر کو جھکاتا ہوں | مشکل کردار ملا

....

یہ عہد جفا کا ہے | دنیا کو جان لیا | دن رات بھٹکتی ہیں
بتلاؤ تو دنیا میں | بھیڑ میں بھی ہم نے | کچھ تشنہ تمنائیں
کیا نام وفا کا ہے | اس کو پہچان لیا | سولی پہ لٹکتی ہیں

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عظیم شاعری اسی وقت وجود میں آ سکتی ہے جب شاعر کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کو پیشِ نگاہ رکھے۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ نذیر۔اے قمر نے اپنی شاعری اور خصوصاً ماہیوں میں زندگی کی سچائیوں اور محبت کی رعنائیوں کو پیشِ نگاہ رکھا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ معاشرے میں مثبت قدروں کے فروغ کے لیے ہمیں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ چلتے چلتے نذیر اے قمر کا ماہیا سُن لیجیے جس میں وہ اپنا منشورِ حیات اور شاعری کا مینی فیسٹو پیش کر رہے ہیں۔

یوں وقت گزاریں گے
ہم لوگ محبت ہیں
منزل کو پکاریں گے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۵/۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

ایک ہوش مند تخلیق کار۔ پریا تابیتا

اس رنگ و بو سے مالا مال پرلطف کائنات کے انتظام وانصرام کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند اصول وضع کیے ہیں۔ اگران اُصولوں کا مربوط طریقے سے جائزہ لیا جائے تو انہیں مادری اور پدری دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مادری اصول دراصل تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کی والہانہ شکل ہے جبکہ پدری اصول تنظیمی معاملات کے مظاہر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اسی بات کو آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ عورت مادری اصول کی علامت ہے اور تخلیق کاری اس کا اولین مقصد ہے۔ جبکہ مرد پدری اصول کی علامت ہے اور ترتیب و تنظیم اس کا بنیادی وصف ہے۔ جس طرح عورت اور مرد کے باہمی ملاپ سے ایک پرسکون گھر تشکیل پاتا ہے بالکل اسی طرح مادری یعنی تخلیق اور پدری یعنی تنظیمی اصولوں کے ملاپ سے معیاری تخلیق وجود میں آتی ہے۔ میرا واضح موقف یہ ہے کہ دنیا کے عظیم ادب اور عظیم تہذیب کے پسِ پردہ یہی دونوں عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے سے عورت کو عضو فاضل کی طرح نکال باہر کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری سوسائٹی سے تخلیق، تہذیب اور شائستگی جیسی صفات معدوم ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس ''مردانہ معاشرے'' میں اگر کوئی عورت اپنی نثری یا شعری تخلیقات کو منظرِ عام پر لے آئے تو حیرت ہوتی ہے۔ **پریا تابیتا** اس لحاظ سے ایک قابلِ قدر اور لائق توجہ تخلیق کار ہیں کہ انہوں نے تنقید و تحقیق اور

شاعری دونوں میدانوں کو اپنے افکار و نظریات کی پیش کش کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ اپنے نسائی جذبات کا جس واشگاف انداز میں اظہار کرتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آسمان شعروادب پر ایک روشن ستارے کی طرح ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔

پریا تابیتا ۳۰ دسمبر ۱۹۸۱ء کو لاہور جیسے علمی وادبی شہر میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ماجد شمشیر گل اور والدہ کیتھرین گل نے پریا تابیتا کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے محنت اور ہمت سے بھی روشناس کرایا۔ میکملن ہائی سکول سے میٹرک اور جناح ڈگری کالج لاہور سے بی۔ اے کرنے کے بعد پریا تابیتا نے اورینٹل کالج سے ایم۔ اے، اور ایم فل کی ڈگریاں حاصل کیں اور آج کل گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں۔ انہوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پوسٹ گریجویٹ کالج وحدت روڈ لاہور میں دو برس تک پڑھایا۔ آج کل وہ ایف سی کالج لاہور میں شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں اور طلبہ و طالبات کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ و طالبات میں علمی وادبی شعور بیدار کرنے کے لیے فارمنائٹس ڈیبیٹنگ سوسائٹی اور حلقۂ اردو ادب کی نگرانی بھی فرما رہی ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں بی۔ ایم حسرت ایوارڈ، نیشنل یوتھ ایوارڈ، تاک کاشمیری ایوارڈ، سیکرڈ ہارٹ ایوارڈ اور قائداعظم گولڈ میڈل سے نوازا جا چکا ہے۔

پریا تابیتا نے اوائل عمر ہی سے شعروادب سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ ان کے بیسیوں تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین ملک کے معروف اخبارات اور رسائل میں شائع ہو کر صاحبانِ علم وفن سے داد وتحسین حاصل کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی اسی آب وتاب سے جاری وساری ہے۔ پریا تابیتا کی درج ذیل تین کتابیں معرضِ وجود میں آ چکی ہیں:

ا) اردو ناول کے منفی کردار (تحقیق وتنقید)

ب) "ہمیشہ روٹھ جاتے ہو (شاعری)

ج) یونس ادیب۔حیات وفن (تحقیق وتنقید)

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے خواتین کو گھریلو کاموں میں اُلجھا کر لکھنے پڑھنے سے دُور کر دیا ہے۔ چند پاکستانی خواتین نے معاشرے سے بغاوت کر کے شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کی اور باقی ماندہ نے افسانوی ادب میں پناہ حاصل کر لی ہے۔ تحقیق اور تنقید کے میدان میں کسی خاتون کو ہنوز حرفِ اعتبار حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ پریا تابیتا اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہوں نے افسانوی ادب کے بجائے تحقیق وتنقید سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا ہے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر اربابِ فہم و ذکا سے دادو تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اگر زمانے نے مہلت دی تو پریا تابیتا تحقیق وتنقید کے اُفق پر ایک روشن ستارے کی طرح جگمگائیں گی۔

''اُردو ناول کے منفی کردار۔ آغاز تا قیامِ پاکستان'' پریا تابیتا کا ایک منفرد تحقیقی کارنامہ ہے۔ اُنہوں نے نہایت مہارت اور عرق ریزی کے ساتھ اُردو نازل کے منفی کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ دانش مند کہتے ہیں کہ دو نفیوں سے ایک اثبات پیدا ہوتا ہے اسی طرح ان منفی کرداروں نے خدا جانے کتنے مثبت کرداروں کو جنم دیا ہوگا۔ پریا تابیتا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اُردو ناول کے گمشدہ منفی کرداروں کو پیش کر کے نئے مباحث کا آغاز کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان منفی کرداروں سے کتنے مثبت کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پریا تابیتا نے اس کتاب کی ترتیب وتسوید میں جو محنت شاقہ کی ہے وہ ان کے روشن مستقبل کی نوید سناتی ہے۔ اگر عصرِ حاضر کی خواتین بھی پریا تابیتا کی طرح تحقیق وتنقید کے میدان کو اپنا مرکز ومحور ٹھہرائیں تو اردو ادب کے لیے

یہ امر نیک فال ثابت ہوگا۔

پریا تابیتا کی تازہ ترین تحقیقی وتنقیدی کتاب معروف تخلیق کار یونس ادیب کی حیات اور فن کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کرتی ہے۔انہوں نے اس کتاب میں یونس ادیب کا خاندانی پس منظر، لاہور میں ان کے علمی وادبی کارناموں اور تصانیف پر سیر حاصل بحث کی ہے۔انہوں نے یونس ادیب کی تمام جہات خصوصاً ناول نگاری، افسانہ نگاری اور سوانح نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے بنیادی اور ثانوی ماخذ سے کام لے کر اس کتاب میں یونس ادیب کے حوالے سے حیرت انگیز معلومات یکجا کر دی ہیں اسی لیے ناقدین نے پریا تابیتا کی اس کتاب کو ایک اہم دستاویز قرار دیا ہے۔

دانش مندوں کے درمیان یہ سوال ہمیشہ باعثِ نزاع رہا ہے کہ کیا شاعری محض جذبات واحساسات کے والہانہ اظہار کا نام ہے؟ میرے نزدیک جو شاعر اپنے اردگرد کے سماجی عوامل سے کنارہ کش ہو کر جذبات کے سہارے شاعری تخلیق کرتا ہے اسے نہ تو عظمت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس کی شاعری مستقبل میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بڑا شاعر اپنے عہد سے ایسے پیوست ہوتا ہے جیسے جڑوں سے شجر اور میں نے اپنی زندگی میں کمزور جڑوں پر چھتنا ور درخت کو کبھی پروان چڑھتے نہیں دیکھا۔

پریا تابیتا ایک ہوش مند شاعرہ ہیں۔انہوں نے دوسری شاعرات کی طرح اپنی شاعری کو محض سطحی جذبات کی بھینٹ نہیں چڑھایا بلکہ اہلِ باطن کی طرح اپنے اردگرد سے اپنی شاعری کا مواد اکٹھا کیا ہے۔ان کی شاعری میں قلبی واردات کے ساتھ ساتھ سماجی رویوں کا بھرپور اظہار بھی ملتا ہے۔انہوں نے معاشرے میں بکھری کہانیوں کو اپنے اشعار میں یکجا کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ''ہمیشہ روٹھ جاتے ہو'' ایک شعری مجموعہ ہونے کے باوجود سماجی کہانیوں کا مرقع محسوس ہوتا ہے۔ پریا تابیتا کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت، عمیق مطالعہ کی عادت اور فنی ریاضت نے اس مجموعے میں بعض ایسے اوصاف

پیدا کر دیے ہیں جو پریا تابیتا کو ہم عصر شاعرات میں ممتاز مقام دلانے کا باعث ہیں۔
پریا تابیتا کی مختلف غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح
اپنے جذبات کو آفاقی قدروں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

لبوں سے کچھ نہیں کہتی میں اکثر ٹال دیتی ہوں
وہ پھر بھی جان لیتا ہے جو میرے دل میں ہوتا ہے

....

تمہاری بے ادائی کا نتیجہ ہیں مرے ہمدم
مری بے ربط تقریریں، مری بے لفظ تحریریں
دل کے صحرا کی تشنگی کے لیے
آنکھ چھلکے فرات ہو جائے

....

کیا فرشتے جان پائیں گے بدی کا فلسفہ
مختلف انسان سے ہے آدمی کا فلسفہ

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ
مہذب معاشروں میں خواتین تخلیق کاروں کی بے حد پذیرائی کی جاتی ہے۔ اگر آج ہم
اپنے معاشرے کو باوقار اور مہذب بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پریا تابیتا جیسی باہنر تخلیق کاروں
کی پذیرائی کرنا چاہیے تاکہ وہ اسی محنت اور رغبت سے علم و ادب کی آبیاری کرتی رہیں۔

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور...... ۲۵ مارچ ۲۰۰۸ء، یکم جنوری ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'دن' ۱۱ر دسمبر ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

شفیق الرحمٰن الٰہ آبادی کا ''آئینۂ خیال''

جب یہ بات طے ہے کہ اب دنیا ایک ''گلوبل ویلیج'' سے سمٹ کر ''گلوبل ہٹ'' میں تبدیل ہوگئی ہے تو کسی ادیب یا ادب کو مضافاتی کہنا بجائے خود محلِ نظر ہے۔ میرا واضح موقف یہ ہے کہ ہمیں اب چھوٹے چھوٹے دوائر کو توڑ کر ایک بڑے دائرے میں شامل ہو جانا چاہیے اور اپنی تنقیدی بصیرت و بصارت کو بھی عالمی معیار کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب وہی تخلیق اہلِ دانش و بینش کی نگاہ میں معتبر ٹھہرے گی جو اہلِ دنیا کے لیے متاثر کن ہو۔ اس رمز سے آشنا ہونے کے بعد پنجاب کے دور اُفتادہ علاقے میلسی کے تخلیق کار **شفیق الرحمن الٰہ آبادی** نے اپنی تخلیقات کو موضوعات اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر آفاقی قدروں سے منسلک کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اپنی اس کاوش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو ناقدین اور قارئین فرمائیں گے۔

شفیق الرحمن الٰہ آبادی ایک طویل عرصے سے تحقیق اور تنقید کی دنیا سے وابستہ ہیں۔ ان کے بیسیوں مضامین مختلف جرائد و اخبارات میں طبع ہو کر صاحبانِ فہم و ذکا سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے ایک گزشتہ مضمون میں راقم الحروف نے انہیں ''میلسی کا روشن آفتاب'' قرار دیا تھا۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ انہوں نے میری اس ہمت افزائی کی قدر کی اور اپنے پہلے تنقیدی مجموعے ''آئینۂ خیال'' کی اشاعت سے میری

عزت افزائی فرما کر میرے موقف کو حرف بحرف درست ثابت کر دیا۔ اس تحقیقی وتنقیدی مجموعۂ مضامین پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، محمد حامد سراج، جمیل احمد عدیل، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، خورشید بیگ میلسوی اور تحسین یزدانی کی گراں قدر آرا روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ تمام ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ شفیق الرحمٰن باصلاحیت تخلیق کار ہیں اور اگر انہوں نے علم وادب سے اسی طرح تمسک برقرار رکھا تو یہ آسمان ادب پر روشن آفتاب کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ اس کتاب کی تشکیل، تخلیق اور تعمیر کے حوالے سے شفیق الرحمٰن ''نقطۂ نظر'' کے عنوان سے رقمطراز ہیں:

''___

> اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ''آئینۂ خیال'' تکمیل کو پہنچی۔ ممکن تھا کہ یہ کتاب مزید تاخیر سے شائع ہوتی اگر حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا یہ حکمت آموز فرمان میری نظر سے نہ گزرتا جس میں آپؑ نے فرمایا ہے کہ ''جو شخص بار بار نتائج پر غور کرتا رہا وہ آگے بڑھنے سے رہ گیا'' میں علم برائے عمل اور ادب برائے زندگی کے نظریے پر یقین رکھتا ہوں کیونکہ علم، عمل اور ادب کا زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

___''

''**آئینۂ خیال**'' میں مجموعی طور پر آٹھ مضامین ہیں جنہیں ہم درج ذیل چار عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ا) نظری مضامین

ا) میلسی کا ادبی منظر نامہ

ب) افسانے کی ہیئت

ب) شخصی مضامین

ا) ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا کرب

ب) ڈاکٹر انوار احمد۔ ایک ہمہ جہت ادیب اور معلم

ج) کتابی مضامین

ا) ''ادبی بیٹھک'' اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ب) ''ساختیات۔ ایک مطالعہ''

ج) ''دُعا کی طرف لوٹتے ہیں''۔ ایک مطالعہ

د) معلوماتی مضمون

ا) اُردو کے مقبول و معروف اشعار

''**نظری مضامین**''میں شفیق الرحمٰن الہ آبادی نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ ان کا مضمون ''میلسی کا ادبی منظر نامہ'' اس لحاظ سے قابلِ قدر اور لائقِ صد تحسین ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ میلسی کے اہم تخلیق کاروں کو صحیح سیاق وسباق کے ساتھ متعارف کرایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون کے ذریعہ ہم محض تخلیق کاروں ہی سے آشنا نہیں ہوتے بلکہ میلسی کی ادبی اور تہذیبی میراث سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہو جاتے ہیں۔ ''افسانے کی ہیئت'' میں شفیق الرحمٰن الہ آبادی نے افسانے کا فنی وفکری مطالعہ کرتے ہوئے اس کے اجزا پر روشنی ڈالی ہے اور دلائل وبراہین سے اُردو افسانے کی ہیئت متعین کرنے کی کاوش کی ہے۔ اپنے اس مضمون کو معتبر اور وقیع بنانے اور اپنے نقطۂ نظر کو واضح بنانے کے لیے انہوں نے پندرہ سے زیادہ ناقدین اور محققین کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے جو ان کی علم دوستی اور تحقیقی بصارت کی واضح دلیل ہے۔

''**شخصی مضامین**''میں شفیق الرحمٰن نے بیسویں صدی کے معروف شاعر ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے

واضح کیا ہے کہ ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا موضوع انتہائی اہم اور وقیع ہے اور اسی ہجرت کے باعث ان کی شاعری میں درد و کرب کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے مختلف ناقدین کی آرا اور ناصر کاظمی کے اشعار کی مثالیں دے کر اپنے موقف کو مضبوط کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ شفیق الرحمٰن کا دوسرا شخصی مضمون اُردو کے صاحبِ طرز افسانہ نگار، عمیق نگاہ محقق، بلند پایہ معلم اور دانش جو نقاد ڈاکٹر انوار احمد کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد ایک طویل عرصے تک ملتان میں علم و ادب کی روشنی بکھیرنے کے بعد آج کل بیرون ملک میں فکر و دانش کے موتی رول رہے ہیں۔ اس مضمون میں شفیق الرحمٰن نے جہاں ایک طرف اپنے مشفق استاد کے لیے کلماتِ تحسین سپرد قلم کیے ہیں وہاں دوسری جانب ان کے افکار و نظریات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عام قاری اس مضمون کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر انوار احمد کی شخصیت، فن اور تخلیقی کارناموں سے کماحقہٗ آگاہ ہو جاتا ہے۔

''**کتابی مضامین**''میں شفیق الرحمٰن نے ''ادبی بیٹھک اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن''میں راقم الحروف کے کالموں کے مجموعے ''ادبی بیٹھک'' پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کتاب کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ ''ادبی بیٹھک'' اپنے موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے اُردو ادب کے نثری سرمائے میں ایک خوبصورت اور نایاب اضافہ ہے۔ شفیق الرحمٰن کا دوسرا کتابی مضمون معروف نقاد، عالمی ادب کے سنجیدہ قاری اور ممتاز تخلیق کار ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی تالیف ''ساختیات۔ ایک تعارف'' کے حوالے سے سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں شفیق الرحمٰن نے محض کتاب کے مندرجات پر ہی بحث نہیں کی ہے بلکہ ساختیات کے موضوع کے حوالے سے بعض اہم اور مفید مباحث پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس کتاب میں ساختیات کے موضوع پر قدیم و جدید نظریات کا جس طرح احاطہ کیا ہے وہ ان کے علمی وفور کا ثبوت ہے اور ان کی یہ

کتاب ساختیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ شفیق الرحمٰن کا تیسرا کتابی مضمون لیہ کے معروف نوجوان شاعر کاشف مجید کے شعری مجموعے ''دُعا کی طرف لوٹتے ہیں'' کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ کاشف مجید ادب دوست، وسیع المطالعہ اور جینوئن شاعر ہیں جو اپنی فکر اور جذبات کو تخلیقی سانچے میں ڈھالنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''دعا کی طرف لوٹتے ہیں'' ان کی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے اور اُردو کے شعری سرمائے میں وقیع اضافہ ہے۔

''معلوماتی مضمون'' اُردو کے مقبول و معروف اشعار'' میں شفیق الرحمٰن الہ آبادی نے ایسے مقبول، معروف اور آوارہ اشعار کا انتخاب کیا ہے جو عوام الناس اور تخلیق کاروں کی نوکِ زبان پر تو ہوتے ہیں لیکن وہ ان کے شاعر کے نام سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض اشعار کے مصرعہ ہائے اولی یا ثانی تو حافظے میں ہوتے ہیں لیکن ان کی تکمیل ممکن نہیں ہو پاتی۔ یہ مضمون ان دونوں کمیوں کو پورا کرتا ہے۔ شفیق الرحمٰن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی عرق ریزی سے مقبول اشعار کے خالقین کا کھوج بھی لگایا ہے اور انہیں حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے کر عام قارئین کے لیے بھی سہل بنا دیا ہے۔ یہ مضمون محققین، ناقدین اور عام قارئین سب کے لیے یکساں مفید ہے۔

شفیق الرحمٰن ایک باصلاحیت محقق اور نقاد ہیں۔ ''آئینۂ خیال'' ان کے مضامین کا اوّلین مجموعہ ہے مگر اس میں نہ تو خود ستائشی کا رنگ ہے اور نہ حمیت کی بُو۔ وہ ایک طالب علم کی طرح مواد کے حصول لیے جستجو کرتے ہیں، اپنی بصیرت و بصارت کی روشنی میں اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور قارئین کے سامنے دریافت شدہ نتائج پیش کر دیتے ہیں۔ آپ کو اس تنقیدی مجموعے میں نظری اور عملی دونوں اقسام کے مضامین مل جائیں گے لیکن ان میں کہیں بھی سطحی پن نہیں ملے گا۔ ان مضامین کا موضوعاتی پھیلاؤ شفیق الرحمٰن کی وسعت نظری، بلند حوصلگی اور علمی دیانت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کتاب کے فلیپ پر معروف نقاد ڈاکٹر سلیم اختر

کی گراں قدر رائے ملاحظہ فرمائیے جو ہمارے موقف کی تائید کرتی ہے۔

"——

بڑے شہر اور ادبی مراکز میں رہنے والے ناقدین اور مدیران جرائد کی نگاہ بالعموم مضافات کے اہلِ قلم تک نہیں پہنچتی۔ جس کی وجہ سے مضافات میں بسنے والے متعدد ادیب، دانشور اور شعرا ناقدری کے سبب ویرانے کا پھول ثابت ہوتے ہیں بلکہ بعض تخلیق کاروں پر تو اس عدم توجہی کا اتنا برا اثر ہوتا ہے کہ وہ ادب ہی سے کنارا کش ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں شفیق الرحمٰن الہ آبادی سے ملا۔ یہ کم گو شخص میلسی میں آباد ہے اور وہیں بیٹھ کر اس نے قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ "شام و سحر" سمیت ملک کے مختلف ادبی جرائد میں اس کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان مطبوعہ مقالات کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ شفیق الرحمٰن الہ آبادی کی تنقید ادبی مباحث و مسائل کے لحاظ سے پُر تنوع ہے۔ اس کی نگاہ میں تازگی اور قلم میں روانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا یہ پہلا مجموعہ آئندہ آنے والے تنقیدی مقالات کے مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

"——

شفیق الرحمٰن الہ آبادی ایک صاحبِ بصیرت نقاد ہیں۔ وہ "عام" چیزوں کو بھی اپنی بصیرت و بصارت سے "خاص" بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے تمام رُخوں کا بھرپور مطالعہ فرماتے ہیں اور تفکر و تعقل کی بنیاد پر اس کے

عیوب ومحاسن کو بڑی ہوش مندی اور سمجھ داری سے اُجاگر کرتے ہیں۔ ان کی علم دوستی اور ادب پروری سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ صاحبان بصیرت کی نگاہوں میں معتبر ٹھہرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ شفیق الرحمٰن نے ''آئینۂ خیال'' کے ذریعہ ہمیں اپنے افکار ونظریات کا ایک ایسا آئینہ فراہم کر دیا ہے جس میں ہم اپنے عہد کی ادبی صورت حال کو دیکھ سکتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شفیق الرحمٰن کے خیالات کے اس آئینہ کو مزید جلا بخشے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کا یہ علمی وادبی سفر اسی آب وتاب سے جاری وساری رہے گا اور وہ وقت دور نہیں جب وہ اپنی محنت اور ریاضت کے باعث آسمان ادب پر ایک روشن آفتاب کی طرح ضوفشانی کریں گے۔

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۲۰، ۲۶، ۳۰/اگست ۲۰۰۸ء، ۲۰ جنوری، ۱۱/نومبر ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور......۲۸ مئی ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

اسد اعوان کا شعری کارنامہ۔ ’نہ اس طرح سے ملو‘

ایک سوال طویل عرصے سے ہر دانش جُو کے ذہن میں گردش کر رہا ہے کہ عصرِ حاضر میں برق رفتار ٹیکنالوجی اور معیشت کی موجودگی میں سست رو شاعری کی کیا ضرورت ہے؟؟؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ معیشت اور ٹیکنالوجی ہمارے طرزِ حیات کو تو تبدیل کر سکتی ہے لیکن ہماری اعلیٰ اخلاقی قدروں سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ شاعری محض انسانی جذبات و احساسات کی پیش کش ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں اعلیٰ اخلاقی اقدار موجزن دکھائی دیتے ہیں۔ معیشت اور ٹیکنالوجی کے اصول اور معیارات زمانے کی ضروریات و مقتضیات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن شاعری میں موجود قدری معیارات غیر متبدل ہوتے ہیں۔ شاعر اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مبلغ بھی ہوتا ہے اور پاسبان بھی۔ اسے معاشرے کے اخلاقی نظام کو مرتب بھی کرنا ہوتا ہے اور اپنی ذات کی تطہیر کے لیے مناسب اقدامات بھی کرنا پڑتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ایک اچھا اور سچا شاعر اپنے عہد کا رسول ہوتا ہے اور جب اس کی قوم آزری میں مصروف ہوتی ہے تو وہ اپنے کلام سے شانِ خلیلؑ اُجاگر کرتا ہے۔ جس طرح ایک رسول کی چشمِ بینا پر ماضی، حال اور مستقبل کے تمام اسرار ہویدا کر دیے جاتے ہیں بالکل اسی طرح ایک سچے شاعر کی شاعری میں ماضی، حال اور مستقبل کی نشانیاں جلوہ گر ہوتی ہیں اور اگر شاعر

اسد اعوان کی طرح ہوش مند، زیرک اور دانا ہو تو وہ خالق کائنات کے حضور یہ التجا کرتا ہے کہ

مری نگاہ سے پنہاں نہ رکھ یہ رازِ جہاں
میں اپنے دور کا شاعر بھی ہوں رسول بھی ہوں

یہ امر انتہائی مسرت انگیز ہے کہ معیشت اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اسد اعوان اعلیٰ اخلاقی قدروں کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ وہ اقبال کی طرح احساسِ مروت کو کچل دینے والے آلات کے مخالف تو نہیں ہیں مگر مال و زر اور مشینوں کی حکومت کے مقابلے پر شاعری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ خالق و مالک ان کی یہ دیرینہ خواہش پوری کر دے

ایک دنیا ہے مرے خواب میں محوِ گریاں
ایک احساس کا عالم مری تقریر میں رکھ

اسد اعوان ایک ایسے ہوش مند اور دور اندیش تخلیق کار ہیں جو مضافات میں رہنے کے باوجود معیاری شعر و ادب کی تخلیق میں مگن ہیں۔ یہ امر باعثِ اطمنان ہے کہ معروف شعری دبستانوں سے دور مقیم شاعروں اور نثر نگاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ یہ بات ہر صاحبِ علم و فن پر واضح کر دی ہے کہ تخلیقی ذہن کہیں بھی جلوہ گر ہو سکتا ہے اور اس کے لیے آباد شہروں کی رونقیں ضروری نہیں ہیں۔ اسد اعوان دنیاوی حرص و آز سے لاتعلق ہو کر اپنے مضافاتی علاقے کی کچی مٹی سے شہ پارے تخلیق کر کے بڑے بڑے شہروں میں بسنے والوں کی نگاہیں خیرہ کر رہے ہیں۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اپنے روغنِ دماغ سے شاعری کا ایک ایسا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں جس کی روشنی سے دور دراز کے تاریک علاقے بھی جگمگا رہے ہیں۔ وہ ہر صاحبِ بصیرت کو تلقین کرتے ہیں کہ

روشنی تیرے چراغوں کی رہے تا بہ ابد
اک دیا جلتا ہوا جادۂ شب گیر میں رکھ

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بوسیدہ خیالات اور پیش پا افتادہ موضوعات کو نیا پیراہن عطا کرنا ایک دشوار عمل ہے۔ اس کے لیے فنکارانہ مہارت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسد اعوان کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی شعرا کے موضوعات و مضامین کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے لیکن اپنی صناعانہ کاوشوں کی بدولت اس میں ایک تازہ پن پیدا کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تازہ ترین افکار و خیالات کو تر و تازہ زبان میں پیش کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''**نہ اس طرح سے ملو**'' کلاسیکیت اور جدت کا حسین سنگم ہے۔ اگر آپ عمیق نگاہی سے اس مجموعے کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو فوراً احساس ہو جائے گا کہ اسد اعوان محض دوسروں کے افکار و خیالات کی بنیاد پر اپنا شعری محل تعمیر کرنے کی کاوش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی شاعری کے لیے نئی نئی راہیں تراشتے ہیں اور میرؔ کی طرح خوش سلیقگی سے خونِ جگر صرف کر کے شاعری کے ایوان کو سجانے کی کاوش کرتے ہیں۔ آپ ان کی زبان ہی سے ان کا دعویٰ سن لیجیے۔

اس سے کہنا یہ مری طرزِ نگارش ہے اسد
خونِ دل صرف ہوا، صرف سیاہی تو نہیں

اسد اعوان کی شاعری میں ایک جانب تو اخلاقی اقدار کے زوال کا نوحہ ہے اور دوسری جانب وہ عصر حاضر کے مسائل و مصائب پر گریاں کناں نظر آتے ہیں۔ وہ ظلم و استبداد کی چکی میں پسنے والے مجبور و بے بس انسانوں کی حالتِ زار پر کڑھتے بھی ہیں اور معاشرتی عدم مساوات اور عدل و انصاف کی عدم فراہمی پر صدائے احتجاج بھی بلند کرتے ہیں تاہم وہ حالات کی یورش سے نہ تو غم زدہ ہوتے ہیں اور نہ مایوس۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرتی اصلاح کے لیے زود اثر تجاویز بھی فراہم کرتے ہیں اور مظلوم و بے کس عوام کو نئے طلوع ہونے والے زمانے کی نوید بھی سناتے

ہیں۔ اسد اعوان کا یہی رجائی نقطۂ نظر انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز بنا دینے کا سبب ہے۔

ہر ایک موڑ پہ لوگوں کو فکرِ نو دے کر
کہیں یہ طرہ، کہیں تخت و تاج بدلا ہے

اسد اعوان کی شاعری میں جدّت کے عناصر بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جدّت روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ وہ اپنے ہم عصر جدید شاعروں کی طرف صرف نئے موضوع کو نہیں برتتے بلکہ ان کی شاعری میں نیا موضوع ایک خاص طرح کا سیاق وسباق مرتب کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار دیکھیے اور اس میں جدّت اور روایت کا حسین امتزاج محسوس کیجیے۔

اک نئی طرز کا کردار دیا جائے گا
اس کہانی میں مجھے مار دیا جائے گا

....

نہ پوچھ قصۂ تشنہ دہاں غریبوں سے
ترے فرات کا پانی بھی آب دیدہ ہوا

....

یہ مر گیا تو عداوت کا لطف کیا ہو گا
اسی وجہ سے عدو کو معاف ہم نے کیا

....

میں تو ناکام ہوا راہِ محبت میں مگر
کامیابی کا ترا کام کہاں تک پہنچا

....

نہ اس طرح سے ملو دوسروں سے ہٹ کے اسے
یہ اجنبی ہے ادھر چار دن رہے نہ رہے

اسد اعوان کا اسلوبِ شعر سادہ اور عام فہم ہے اور اسی باعث دل میں تیر کی

طرح پیوست ہو جاتا ہے، وہ بھاری بھرکم اور غیر مانوس الفاظ کے بجائے سادہ اور عام فہم الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ ان کا اسلوب شعر ان کی شخصیت کے اخلاص سے تشکیل پاتا ہے۔ وہ نہ تو شہرت کے خواہاں ہیں اور نہ مال و متاع کے تمنائی۔ انہیں علم ہے کہ جو لوگ سستی نمود و نمائش کے ذریعہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں وہ بہت جلد نیچے گر جاتے ہیں۔ وہ شہرت کے خواہاں افراد پر واضح کر دیتے ہیں کہ ؂

یہ شہرت کا مسافر شہر بھر میں
بہت بدنام ہو جائے گا اک دن

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ معیشت اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی آبیاری کے لیے شاعری کی بے پناہ ضرورت ہوتی ہے۔ اسد اعوان نے اپنی شاعری کے ذریعہ اخلاقی اقدار کے تحفظ اور فروغ کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کیا ہے۔ اسد اعوان کا شعری سفر خوب سے خوب تر کی تلاش میں جاری و ساری ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کامیاب و کامگار کرے تاکہ وہ بنجر معاشرے کو اسی طرح اپنے زرخیز افکار و نظریات سے مالا مال کرتے رہیں اور ان کی یہ دیرینہ حسرت پوری ہو جائے ؂

ہر کوئی رشک کرے تیری بلندی پہ اسدؔ
ایسی بنیاد کوئی جذبۂ تعمیر میں رکھ

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۱۲ر اکتوبر، ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

فدائے اُردو۔ سیّد روح الامین

کسی بھی ملک کی تہذیبی ساخت میں وہاں کی زبان کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ زبان کی تشکیل وتعمیر میں وہاں کی تہذیبی، سماجی، علمی، مذہبی اور معاشی صورتِ حال بھی اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اردو زبان خالصتاً برصغیر کی دین ہے۔ یہ کہنا صریحاً لسانی بددیانتی ہے کہ اُردو زبان محض مسلمانوں کی زبان ہے یا مسلمانوں کی برصغیر آمد سے مشروط ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زبانیں مذہب سے نہیں بلکہ مقامی تہذیب وثقافت سے وجود میں آتی ہیں۔ اگر زبان مذہب کی بنیاد پر وجود میں آتی تو آج ہر مذہب کی اپنی جداگانہ زبان ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اُردو محض مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے باعث وجود میں آئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں کی آمد کے باعث کون سی نئی زبان وجود میں آئی......؟؟ یا ایران کی فتح کے بعد وہاں کون سی نئی زبان معرضِ تخلیق میں آئی......؟؟ ظاہر ہے کہ برصغیر میں ایک مخلوط کلچر تھا جس میں عربی، ایرانی، افغانی، انگریز، ولندیزی، ہسپانوی، ترک غرض ہر نسل کے افراد باہمی میل ملاپ سے ایک نئی زبان کا خمیر تیار کر رہے تھے جو بعد میں اُردو کے نام سے معرض وجود میں آئی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ اردو دراصل ہندوستانی تہذیب وثقافت اور بین الاقوامی ثقافتی ورثہ کا حسین اور دل آمیز امتزاج

ہے۔ یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے کر ایک جانب تو اس کی بین الاقوامی تہذیبی حیثیت کو تسلیم کیا اور دوسری جانب پاکستان کو اردو کی پناہ گاہ قرار دے دیا، تاہم یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ پاکستان میں اس زبان کے تحفظ و فروغ کے لیے وہ کام نہ کیا جا سکا جس کی وہ مستحق تھی۔ یہ بات کتنی معنی خیز ہے کہ ساٹھ برس قبل ہم نے 'ترقی اردو' اور 'فروغ اردو' کے لیے مساعی کیں اور آج ہم 'تحفظِ اردو' کے لیے کوشاں ہیں۔ اب تو یہ کام نوجوان نسل کا ہے کہ وہ برصغیر میں روشنی دیتی ہوئی 'شمعِ اردو' کو اپنے خونِ جگر سے فروزاں رکھیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ نوجوان نسل میں **سید روح الامین** اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے شبانہ روز جست و خیز کر رہے ہیں۔ انہیں خبر ہے کہ اپنی زبان کو جدید رویوں کا حامل بنا کر ہی ہم دنیا میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم قومی ترقی کے طلبگار ہیں تو ہمیں فدائے اردو سیّد روح الامین کی طرح اُردو زبان کے تحفظ و فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لانا پڑیں گی ورنہ بقول اکبرالہ آبادی:

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں

سید روح الامین ۵ راگست ۱۹۷۰ء کو ایک پاک باطن اور درویش منش پیر سید کرامت علی کے گھر منڈی بہاء الدین پنجاب میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایم۔ اے اُردو اور ایل۔ ایل۔ بی کی اسناد امتیازی حیثیت میں حاصل کیں اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے یوں تو مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی مگر اردو زبان کی تحقیق و تدوین اُن کا خاص موضوع قرار پائی۔ اُن کی درج ذیل کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:

- پانچ دریا (اقبال پر مقالات)
- اردو ہے جس کا نام
- اردو ایک نام محبت کا
- اردو بطور ذریعہ تعلیم
- اردو لسانیات کے زاویے
- اردو کے لسانی مسائل
- اقبال ۔ شاعری اور فکر و مقام
- اردو تاریخ و مسائل
- اقبال ۔ فکر و فن
- اردو کے دھنک رنگ

اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے حوالے سے اُن کی چھ اہم کتابیں بہت جلد منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اردو زبان سے تمسک کے باعث اُنہیں بے شمار اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ ملک کی تین مختلف یونیورسٹیوں میں اُن کی شخصیت اور فن پر مقالات لکھوائے جا چکے ہیں اور بہت سی یونیورسٹیوں میں اُن کی کتابیں نصاب میں داخل ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب وہ اردو زبان پر فدا تھے مگر اُن کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں کے باعث آج اردو زبان اُن پر فدا ہو رہی ہے۔

سید روح الامین کے دو ممدوحین ہیں اول اقبال اور دوم اردو زبان۔ انہوں نے پانچ دریا، اقبال فکر و فن اور اقبال ۔ شاعری اور فکر و مقام جیسی تالیفات شائقین اقبال کی خدمت میں پیش کیں اور سرخرو ہوئے۔ اسے اقبال کا فیض سمجھیے کہ سید روح الامین اردو زبان کی جانب متوجہ ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ اردو زبان کے شیدائیوں کی خدمت میں یکے بعد دیگرے سات معرکۃ الآرا تالیفات پیش کر کے

اردو کے فدائین میں اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی تحقیق و جستجو کا سلسلہ جاری ہے اور جلد ہی ان کی دیگر کتابیں بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائیں گی۔ اس طرح ناقدین فن یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اردو زبان سید روح الامین کی زیست کا بنیادی جزو بن گئی ہے۔ بقول حبیب جونپوری:

خطۂ ارض پہ کیا شان ہے تیری اردو
تو مری زیست کا عنوان ہے میری اردو

سیّد روح الامین کی زندگی کا مرکز و محور 'اردو' ہے۔ ایک ایسے دور میں جب لوگ زر کی تلاش میں سرگرداں ہیں روح الامین لیلائے اردو کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں۔ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے پاکستانی ہیں لہٰذا وہ پورے دیس میں اردو کا عملی نفاذ چاہتے ہیں۔ ان کا واضح موقف یہ ہے کہ ایک زندہ اور غیرت مند قوم کی طرح ہمیں بھی اپنے ہر شعبۂ حیات میں اردو کو عملی طور پر نافذ کرنا چاہیے۔ عصرِ حاضر کی ناگفتہ بہ صورتِ حال میں جبکہ ہمارا ملک لسانی کشمکشوں کا شکار ہو چکا ہے اور اردو زبان کے تحفظ کے ذرائع تلاش کیے جا رہے ہیں، سید روح الامین کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ ہمیں اپنی بقا، ذہنی ہم آہنگی اور ثقافتی تحفظ کے لیے اردو زبان کو اپنی ڈھال بنا لینا چاہیے۔ سید روح الامین نے اپنی سات گراں قدر کتابوں میں محض اردو کی عظمت اور افادیت ہی کو اُجاگر نہیں کیا ہے بلکہ اردو زبان کے لسانیاتی زاویوں اور مسائل کو بھی ایک دیدہ ور کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اردو زبان کا تاریخی اور تحقیقی حوالوں سے مطالعہ کرنے کی مشکور سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو زبان کو تعلیمی زبان قرار نہ دینے پر اظہار ملال کیا ہے اور ان اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے جو اردو کو دفتری زبان بننے میں حارج ہیں۔ سید روح الامین نے اردو کو محبت اور اخوت کی زبان قرار دیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر ہم مملکتِ خداداد پاکستان میں امن،

آشتی اور بھائی چارے کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی قومی زبان اردو کے فروغ کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لا کر داغ دہلوی کا یہ نظریہ سچ ثابت کر دینا چاہیے کہ۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
''سارے جہاں'' میں دھوم ہماری زباں کی ہے

سیّد روح الامین نے اپنی تخلیقی زندگی کے سفر میں صرف اردو کو اپنا ممدوح بنایا اور اردو زبان کا فیض دیکھیے کہ آج سارا زمانہ ان کا مداح ہے۔ ان کے مداحین میں ڈاکٹر سلیم اختر، فتح محمد ملک، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، فرخ زہرا گیلانی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر سعید مرتضٰی زیدی، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر سید حسن رضوی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، عشرت لقمان، حامد حسن سید، نصیر احمد چودھری، ڈاکٹر جاوید اقبال اور محمد احمد سبزواری جیسے اکابرین شامل ہیں۔ اردو زبان کے حوالے سے سید روح الامین کا تحقیقی و تنقیدی سفر جاری ہے۔ اردو کے حوالے سے ان کی کئی کتب زیرِ طبع ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں اپنے نادر موضوعات، تحقیقی ادراک، تنقیدی بصیرت، اصابت رائے، مثبت طرزِ احساس اور بے لوث ریاضت کے باعث سید روح الامین کی تمام کتابیں ایک ادبی دستاویز کا درجہ حاصل کر جائیں گی۔ آج وہ فدائے اُردو ہیں اور ان کی بے مثال خدمات کے بعد اب اردو ان پر فدا ہو رہی ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اگر ہم اپنی تہذیب و ثقافت کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے شبانہ روز محنت کرنا چاہیے۔ ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم جملہ متداولہ علوم کو اردو زبان میں منتقل کریں تاکہ ہمارے نوجوان علمی سطح پر اپنے ہم عصروں کا کماحقہٗ مقابلہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے وابستہ کر دینا چاہیے۔ ہمارا

ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ ہم اردو کو روزگار سے جوڑ دیں تا کہ نوجوان بھی اس زبان سے تعلق خاطر جوڑنے کے ساتھ ساتھ روٹی روزی کے مسائل سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ عصرِ حاضر میں نوجوانوں کو اردو زبان سے قریب لانے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ ہم ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کریں جو اردو زبان کی ترقی وترویج میں مستعد ہیں۔ اس حوالے سے سید روح الامین کی اردو زبان کے لیے بے مثال خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے اور انہیں تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کرنا چاہئیں تا کہ وہ اسی طرح اردو زبان کی خدمت کرتے رہیں۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ جب تک سید روح الامین جیسے فدایان اردو موجود ہیں اردو پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ سید روح الامین کے دل میں اردو کے لیے یہ جنون قائم رہے۔

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور...... ۲۷ر اپریل ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

●●●

اعظم کمال کی رجوعی غزلیں —— 'غزل نو'

ہمارے ملک کی ابتر سیاسی صورتِ حال نے معاشرے کے ہر طبقہ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ خاص طور پر شعروادب سے ناتا رکھنے والے تخلیق کار اس صورتِ حال سے کبیدہ خاطر دکھائی دے رہے ہیں۔ پورے معاشرے میں اب کیا ہوگا؟؟؟ کے خدشات جنم لے رہے ہیں اور پوری قوم بے سمت سفر کر رہی ہے۔ اس بے سمتی کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے عہد کا شاعر شکوہ سنج ہے کہ

کتنا حسیں فریبِ نظر کھا رہے ہیں لوگ
دو کشتیوں میں پاؤں ہیں اور جا رہے ہیں لوگ

یہ بات **اظہر من الشمس** ہے کہ ہمارے عمومی تخلیق کار واضح حکمتِ عملی سے محروم ہیں۔ دانش مند تخلیق کار بند دماغوں مگر کھلی آنکھوں سے کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ سیاست کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے تاہم یہ بات طے ہے کہ اگر تذبذب کی یہ صورتِ حال چند ماہ مزید جاری رہی تو پوری قوم فکری انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ سیاسی استحکام سے ملکی معیشت اور معاشرت کو ایک مرتبہ پھر استحکام مل جائے لیکن کوئی بھی ہوش منداس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ فکری انتشار کی حامل قوم دوبارہ لوحِ عصر پر اپنے اثرات مرتسم کر سکے۔ اسی لیے **اعظم کمال** نے اس کرب کو ایک نئے پیرائے میں اُجاگر کر دیا ہے۔

وقت کے گرداب نے ایسے بکھیرا ہے مجھے
جانتا ہوں وہ مجھے تعمیر کر سکتا نہیں

اس ابتر صورتِ حال میں ادیبوں اور شاعروں کے لیے لازم ہے کہ وہ اعظم کمال کی پیروی کرتے ہوئے قوم کو حق و صداقت کی راہ دکھائیں اور اپنے افکار و نظریات کے ذریعہ پوری قوم کو اُمید و رجا کا پیغام دیں کہ ۔

اس کے رُکنے سے رُکی ہے زندگی
آپ یہ لمحہ بدل کر دیکھیے

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کے تمام اصناف اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف زمانوں میں قابلِ قدر اور لائق توجہ رہے ہیں تاہم غزل کو دوسرے اصناف پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ یہ ہر عہد میں عوام الناس کی پسندیدہ اور مرغوب صنفِ سخن رہی ہے۔ غالب پہلے غزل گو تھے جنہوں نے غزل کے راستے کو محدود قرار دیا اور ایک غزل میں اعلان کر دیا کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

الطاف حسین حالی نے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مقدمہ شعروشاعری میں غزل کی تنگ دامانی کا محض گلہ ہی نہیں کیا بلکہ اس صنفِ سخن کی اصلاح کے لیے چند مفید بلکہ نیک مشورے بھی دیے۔ اقبال وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے غزل کے مزاج اور مذاق کو یکسر تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انہوں نے ایک جانب تو غزل کو موضوعاتی تنوع عطا کیا اور دوسری جانب غزل میں پہلی مرتبہ نظمیہ تسلسل قائم کرنے کی شعوری کاوش کی۔ اقبال غزل کی مروجہ ہیئت میں تو کوئی تبدیلی نہ لا سکے لیکن انہوں نے غیر مردّف غزلوں کے ذریعہ غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کرنے کی کامیاب کاوش کی۔ اقبال کی زندگی

ہی میں ''اینٹی غزل'' کا تصور پیدا ہو چکا تھا اور خاص طور پر ترقی پسند شعرا نے غزل کو جاگیردارانہ سماج کی پیداوار قرار دے کر مطعون کرنے کی کاوش کی اور نظم کے فروغ کے لیے تمام ممکنہ وسائل کو استعمال کیا۔ جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی اور یاس یگانہ چنگیزی نے اپنی ہمہ رنگ غزلوں سے صنف غزل کو زندہ و تابندہ رکھنے کی بھرپور کاوش کی۔ نظم نگاروں کے ہیئتی تجربات نے نظم کو ایک نیا روپ عطا کرنے کی کاوش کی۔ پابند نظم نے معریٰ، آزاد اور نثری نظم کا چولا بدلا۔ نظم میں رائج اور مقبول ہونے والی تبدیلیوں کی دیکھا دیکھی بہت سے غزل گو شعرا نے بھی آزاد غزل، مکالماتی غزل اور نثری غزل کے تجربات کیے جو غزل کے شائقین کے لیے جاذبِ نظر اور قابلِ توجہ نہ ہو سکے۔ اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ظفر اقبال کی شاعری سے بدظن ہو کر احمد فراز کی شاعری سے لطف اندوز ہونے لگے۔ میرے خیال میں ظفر اقبال کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی صناعانہ صلاحیتوں کی بدولت اُردو غزل کو موضوع اور ہیئت ہر دو اعتبار سے مالا مال کرنے کی کامیاب کاوش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل کی صنف میں ظفر اقبال کے علاوہ کوئی اتنا بڑا رسک (Risk) لینے کا اہل ہی نہیں تھا۔ مقامِ مسرت ہے کہ غزل کا ارتقائی سفر جاری ہے اور

ع آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

''غزلِ نو'' اعظم کمال کی رجوعی غزلوں کا اوّلین مجموعہ ہے جن میں اُنہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ؎

لے چلا ہوں میں غزل کو ایک تازہ سمت میں
یہ نشانِ راہ ہو گی آنے والے وقت میں

اپنے اس عظیم الشان دعوے کی دلیل میں انہوں نے اس مجموعۂ غزلیات کو پیش کیا ہے۔

رجوعی غزل کیا ہے؟ اس کا جواب خود اعظم کمال یوں دیتے ہیں:

''قافیہ اور ردیف کسی بھی غزل کا حُسن ہوتے ہیں۔ میں نے غزل کے اس حُسن کو مزید نکھارنے اور نمایاں کرنے کے لیے غزل کے ہر شعر کے مصرع ثانی کی طرف یوں رجوع کیا ہے کہ اس کو جُوں کا تُوں دہرا کر قافیہ تبدیل کرتے ہوئے مصرع اولیٰ کے ساتھ اس طرح باندھا ہے کہ مصرع ثانی پر معنوی جہت کے حساب سے بالکل نئے مصرعے کا گماں ہوتا ہے۔ یوں میں نے اس نئی غزل کو ایک نئے نام ''رجوعی غزل'' سے موسوم کیا ہے۔''

ایک طویل ہیئتی بحث میں الجھنے کے بجائے آپ اعظم کمال کی ایک رجوعی غزل ملاحظہ فرمالیجیے:

اِس سے بڑھ کر اور کوئی واسطہ ہوتا نہیں
اِس سے بڑھ کر اور کوئی راستہ ہوتا نہیں

انتہا کی بات کرنے سے یہ پہلے سوچ لو
اس سے بڑھ کر اور کوئی ضابطہ ہوتا نہیں

سوچتا ہوں جب کبھی میں ساتھ پاتا ہوں اُسے
اِس سے بڑھ کر اور کوئی رابطہ ہوتا نہیں

اپنے ہاتھوں سے جلانا اپنی ہی تصویر کو
اس سے بڑھ کر اور کوئی حادثہ ہوتا نہیں

جو چلا تھا دین کی خاطر فقط کرب و بلا
اِس سے بڑھ کر اور کوئی قافلہ ہوتا نہیں

لکھ دیا ہے لکھنے والے نے تمھیں سب سے الگ
اِس سے بڑھ کر اور کوئی سلسلہ ہوتا نہیں

جب کوئی اعظم زمانہ چھوڑ دے تیرے لئے
اِس سے بڑھ کر اور کوئی سانحہ ہوتا نہیں

اعظم کمال نے جس رجوعی غزل کو آنے والے وقت کے لیے نشان راہ قرار دیا ہے اس کے نمونے اُردو اور فارسی غزل میں پہلے سے موجود ہیں۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ اس ہیئت میں کسی شاعر کا پورا مجموعہ ہنوز میری نظر سے نہیں گزرا ہے اس اعتبار سے اولیت کا تاج اعظم کمال کے سر ہی جاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر عاصی کرنالی، حمایت علی شاعر، افتخار عارف، محسن بھوپالی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر معین قریشی، افسر ساجد اور جان کاشمیری جیسے اکابرینِ نقد و نظر نے اعظم کمال کے اس تجربے کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کے اسرار و رموز پر کماحقہٗ روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں میرا واضح موقف یہ ہے کہ محض کسی ''خود ساختہ'' ہیئت کے باعث کوئی شاعر حرفِ اعتبار حاصل نہیں کر سکتا۔ مسندِ اعتبار پر وہی شاعر متمکن ہو سکتا ہے جو اپنے افکار و نظریات کو انتہائی سلیقے اور ہوش مندی سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ میرے نزدیک اعظم کمال کا اعزاز یہ نہیں ہے کہ انہوں نے محض رجوعی غزلیں لکھیں بلکہ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے رجوعی غزلوں میں اپنی کلاسیکی غزل کی روایت کو تر و تازہ کرنے کی مشکور سعی کی ہے۔ رجوعی غزل کے مباحث سے قطع نظر آپ اعظم کمال کی مختلف غزلوں کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ ان اشعار میں ہماری کلاسیکی غزل کا رنگ اور آہنگ موجزن ہے یا نہیں۔

میرے گھر میں چھا گئے ہیں اب اندھیرے چار سو
اس کے گھر میں دیکھتا ہوں روشنی کے سلسلے

....

دن کے ہنگاموں سے اس کی آنکھ بھی تر ہو گئی
کیا کبھی دیکھا ہے تو نے شام کو روتے ہوئے؟

آنکھ میں کرچیاں سی پھیل گئیں
میں عجب رتجگوں کا قیدی ہوں

....

ہو معلوم جس کو تقاضائے تخلیق
میں دنیا میں ایسا بشر ڈھونڈتا ہوں

....

بنایا ہے تجھے صدیوں میں مَیں نے
مرے شہکار مجھ سے مت بچھڑنا

....

تیری آنکھیں تھیں کہ میخانہ کوئی
ہم تو جاں مدہوش ہو کر رہ گئے

....

دہر میں اعظم قضا کا ذکر کیا
بیچ دیتے ہیں جزا کو لوگ بھی

رجوعی غزل میں دوسرے مصرعے میں محض قافیہ تبدیل کرنا ایک میکانکی عمل معلوم ہوتا ہے تاہم اعظم کمال نے کوشش کی ہے کہ اس صورت میں بھی غزل کے بنیادی مزاج کو قائم رکھا جائے اور اسے میکانکی سطح سے اٹھا کر تخلیقی سطح پر لے جایا جائے۔ یہ وہ ہنر ہے جو محض نیا تجربہ کرنے والے شعرا کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ آپ اعظم کمال کی درج ذیل غزل کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمالیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے اس رجوعی غزل کے ہر شعر کے مصرعہ ہائے ثانی میں محض قافیہ تبدیل کیا ہے مگر غزل کی چاشنی میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

تنہا میں ہوں، تنہا تُم ہو، آؤ مل کر جی لیتے ہیں
تنہا میں ہوں، تنہا تُم ہو، آؤ مل کر پی لیتے ہیں
چاک گریباں تم رکھتے ہو، میرا بھی ہے، دامن چاک
تنہا میں ہوں، تنہا تُم ہو، آؤ مل کر سی لیتے ہیں
میں بھی پیاسا، تم بھی پیاسے، امرت کا اک گھونٹ ہے باقی
تنہا میں ہوں، تنہا تُم ہو، آؤ مل کر پی لیتے ہیں
اک مُدت سے ڈھونڈ رہے ہو جانے کس کو اعظم تم
تنہا میں ہوں، تنہا تُم ہو، آؤ مل کر جی لیتے ہیں

اعظم کمال کی رجوعی غزلوں نے ابھی تو محض ناقدین اور کاملین فن کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب عوام الناس بلکہ غزل کے شائقین بھی اعظم کمال کے کمالات کے معترف ہوں گے اور وہ رجوعی غزل کے امام بن کر اپنے مقلدین کے لیے مشعلِ راہ بن جائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اعظم کمال کی چھوٹی موٹی شاعرانہ لغزشوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کی رجوعی غزلوں کا استقبال کریں ورنہ وہ حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہوئے کہیں گے کہ

لے گیا اعظم جسے پہچان تھی
کوئی مجھ کو تولتا ہی رہ گیا

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۱۹ر ستمبر، ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء، ۱۷ر جنوری، ۲۳ فروری ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور......۲۲ر اگست ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

لفظوں سے تصویر بنانے والی شبہ طراز

انسان کی زندگی جذبات واحساسات سے پُر ہے۔ انسان کی زندگی کا ہر لمحہ اسے کسی نہ کسی جذبے سے منسلک کر دیتا ہے۔ دانش مندوں کا کہنا ہے خوشی وغم دو بنیادی انسانی جذبے ہیں اور انسان انہی کے سہارے اپنی وسیع وعریض زندگی بسر کر دیتا ہے۔ یہ دونوں جذبے انسان کی ہستی کے محافظ بھی ہوتے ہیں اور انہی کے باعث انسان تباہی کے دھانے تک پہنچ جاتا ہے۔ اپنے جذبات واحساسات کی تسکین اور آرائش کے لیے انسان نے طرح طرح کے سلیقے اور رنگا رنگ طریقے وضع کر رکھے ہیں۔ آپ فنونِ لطیفہ کے تمام رنگوں اور ذائقوں کو دیکھ لیجیے آپ خود محسوس کریں گے کہ ہر فن صرف اور صرف لطف پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے اور تسکین قلب کا باعث ہے۔ رقص ہو یا مصوری، شاعری ہو یا موسیقی جب تک فنکار اس میں اپنا خونِ جگر شامل نہیں کرتا، اس کے فنِ لطیف پر نکھار نہیں آ سکتا۔ دیگر فنونِ لطیفہ کی نسبت شاعری ایک دشوار عمل ہے۔ شاعر کو سب سے پہلے مردہ حرفوں میں جان پیدا کرنا پڑتی ہے اور جب حروف متحرک ہو جاتے ہیں تو اسے ان سے ایسی تصویریں وضع کرنا پڑتی ہیں جنہیں وہ دوسروں کی نگاہوں کے سامنے لے آئے۔ مصور اور شاعر کی بنائی ہوئی تصویر میں واضح فرق یہ ہے کہ مصور اور ناظر کی آنکھ متصل ہو کر تصویر دیکھتی ہے جبکہ شاعر کی تخیلاتی تصویر کو ہر ایک اپنے زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس طرح شاعر اور

ناظر کی آنکھ میں بعض اوقات بعد المشرقین پیدا ہو جاتا ہے اور یہیں سے شاعری دیگر فنونِ لطیفہ میں ممتاز نظر آنے لگتی ہے۔ ایسے تخلیق کار بہت کم ہیں جنہوں نے صادقین یا اسلم کمال کی طرح شاعری اور مصوری کو آمیخت کر دیا ہو۔ اردو شاعرات میں **شبہ طراز** کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شعر وادب اور مصوری دونوں سے تعلقِ خاطر قائم کر رکھا ہے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں قلم ہے جس سے وہ شعر وادب کے گل بوٹے تراشتی ہیں اور بائیں ہاتھ میں ایک نرم و نازک برش ہے جس سے وہ بولتی ہوئی تصویریں وضع کرتی ہیں۔ شعر وادب ان کے گھرانے کی میراث ہے اور مصوری ان کے بچپن کا شوق۔ اس طرح شبہ طراز کا ذہنی اُفق وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کے نادر نمونے ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ انہوں نے جہاں ایم۔ اے اردو کر کے اپنی شعری و ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے وہاں این سی اے سے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی ہے اور مختلف رسالوں اور کتابوں کے پانچ سو سے زیادہ سرورق بنانے کا اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ عصرِ حاضر میں شعر وادب اور مصوری کا حسین امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں تو شبہ طراز کی تخلیقات کا مطالعہ فرمائیے آپ کو یقیناً ان کی شاعری سے مصوری اور مصوری سے شاعری کا لطف آئے گا۔

شبہ طراز ایک طویل عرصے سے شعر و ادب سے منسلک ہیں۔ ان کی درج ذیل تخلیقات زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

(۱) جگنو ہنستے ہیں (شاعری۔ ہائیکو، ماہیے)

(۲) جھیل جھیل اُداسی (شاعری۔ نظمیں)

(۳) چاندنی میں رقص (شاعری، ہائیکو، تراجم)

(۴) درد کا لمس (افسانے)

شبہ طراز کی درج بالا تخلیقات کے بغور مطالعہ کے بعد ہم ان کے تخلیقی کارناموں کو درج

ذیل دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(ا) شاعری (ب) افسانے

اب ذیل میں ان دونوں نوعیتوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

شبہ طراز کے شعری افکار تین اصناف نظم، ہائیکو اور ماہیے میں جلوہ گر ہوئے ہیں اور انہوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ ان کا تخلیقی سفر مائل بہ ارتقار ہے اور اسی باعث انہوں نے معروف بین الاقوامی تخلیق کاروں کے ہائیکوں کے تراجم کر کے ایک جانب تو اپنے ذہنی اُفق کو وسعت عطا کی ہے اور دوسری جانب اس کم توجہ صنف کی اہمیت دوبالا کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبہ طراز کی شاعری داخلی جذبات واحساسات کی عکاس ہے۔ وہ اپنے باطن کا سفر انتہائی بے باکی سے کرتی ہیں۔ عورتوں کے جذبات کو پیش کرنا آج کل کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن نسائی جذبات کی پیش کش میں نفاست اور پاکیزگی کو پیش نظر رکھنا شبہ طراز کا خاص وصف ہے۔

شبہ طراز کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ انہوں نے انفس سے آفاق کا سفر کیا ہے۔ ذات کے آلام کو آفاق کے مصائب کے ساتھ جوڑنا بے حد دشوار ہے اور شبہ طراز نے اس ''مشکل'' کام کو اپنی تخلیقات کے ذریعے ''آسان'' کر دیا ہے۔ آپ شبہ طراز کے درج ذیل ہائیکو ملاحظہ فرمایئے اور انفس وآفاق کے مختلف مدارج کا خود ہی فیصلہ کیجیے۔

میری کاجل بھری ان آنکھوں میں
شام ڈھلتی نہیں کہ رات آئے
نیند سپنوں سے ڈر گئی شاید

....

اے مرے شہر تیری سڑکوں پر
میں کہ بکھری پڑی ہوں چار طرف
جیسے پتے خزاں کے موسم میں

شبہ طراز کی شاعری میں میر تقی میر کی عمیق نگاہی، غالب کی بلند فکری یا اقبال کی فلسفیانہ موشگافی نہیں ملتی ہے بلکہ وہ اپنے ذاتی تجربات واحساسات پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں بہاروں، تتلیوں، پھولوں، رنگوں، رتجگوں، چاندنی، روشنی، شام، موسم، چاند، باغ، کہکشاں، خوشبو، دھوپ، نیند، سپنے، صحرا، تارا، بارش، بادل، بچے، گاؤں، چوپال، جگنو، خواب، شمع، پروانہ، گھاس، منڈیر، دریچہ، پربت وغیرہ کا ذکر ان کی زندگی کی مختلف علامتوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آپ ان کے درج ذیل ماہیے ملاحظہ فرمائیے اور ان میں ذات اور آفاق کے مختلف رنگ اور روپ ملاحظہ فرمائیے:

تھی شام خزاؤں کی
تم نے نہیں چھیڑی
کوئی بات وفاؤں کی

....

میں تم کو سزا دیتی
تم پھول اگر ہوتے
کاپی میں چھپا لیتی

....

جگنو ہیں ستارے ہیں
ہم وقت سمندر پر
تقدیر کے دھارے ہیں

شبہ طراز کا اسلوبِ شعر سادہ، عام فہم اور سریع الاثر ہے انہوں نے اپنے سچے جذبات کو سچی زبان عطا کر کے اپنا نیا شعری اسلوب وضع کیا ہے جو ان کی صداقت بردار شخصیت کا غماز ہے۔ ان کی اس سادہ بیانی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے

کہ ان کی شاعری ایک شفاف آئینہ بن گئی ہے جس میں ہم اپنے چہروں کی بآسانی شناخت کر سکتے ہیں۔

شبہ طراز نے افسانوی ادب میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ ان کے تیئس (۲۳) افسانوں کا مجموعہ ''درد کا لمس'' اپنی جدت اور ندرت کے باعث صاحبانِ فہم و ذکا کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کا سبب بنا ہے۔ شبہ طراز روایتی افسانہ نگار نہیں ہیں کہ جو دو دلوں کو توڑنے اور جوڑنے کے قصوں کو نمک مرچ لگا کر پیش کر دیں بلکہ انہوں نے اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو تخلیق کی تیسری آنکھ سے دیکھا ہے اور اپنی ذات کا حصہ بنا کر افسانوی شکل میں قارئین کی نذر کر دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شبہ طراز کے افسانے روایتی ہونے کے باوجود روایتی نہیں ہیں بلکہ اپنے اندر ایک جہانِ معنی لیے ہوئے ہیں۔ آپ ان کے افسانوں 'بجھتے سورج کی چیخ'، 'چپ کے تالے' اور اندیشوں کی اڑان کا مطالعہ فرمالیجیے آپ خود محسوس کریں گے کہ ان افسانوں کے اندر ایک خاموش کہانی بھی رواں دواں ہے۔ آپ اسے علامت کا نام بھی دے سکتے ہیں مگر یہ علامت ہو کر بھی علامت سے جدا چیز ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں بے زبان، بابا جی کی بیٹھک، ادھورے خواب اور کرائے کا گھر میں ہماری عمومی زندگی کی کہانیاں پیش کی گئی ہیں لیکن اس کے باوجود عام بات کو خاص بنا دینا شبہ طراز کا افسانوی ہنر ہے۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کے باعث جان پڑ جاتی ہے اور وہ ہمارے گرد و پیش ہی سے کرداروں کا انتخاب کرتی ہیں۔ شبہ طراز کے کردار محض کٹھ پتلی نہیں ہوتے بلکہ وہ افسانوں میں اپنا زندگی سے بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ خانزادہ شوکت علی، وزیر بیگم، مائرہ، بابا جی، سعیدہ، نجمہ، عالم، مونا صفدر علی، نادیہ اور سیما وغیرہ کے کرداروں کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمالیجیے آپ کو یہ تمام کردار جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ شبہ طراز کے بیشتر افسانوں میں وہ خود مرکزی کردار ہیں۔ میرے خیال میں ان کے بیشتر افسانے ''خود کلامی'' ہیں۔ وہ ایک

داستان گو کی طرح اپنے قارئین کو متاثر کرنے کے لیے ہر کہانی کو اپنی ذات کے تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی متمنی ہوتی ہیں۔ کبھی ان کی شمولیت کہانی کو جاندار بنا دیتی ہے اور کبھی کبھار اس طرزِ عمل سے قصے کا حسن مجروح ہو جاتا ہے۔ یہ بات بہر حال طے ہے کہ شبہ طراز چھوٹی سی بات سے افسانہ تخلیق کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کے افسانوں کا اسلوب بھی ''سرگوشی'' کی کیفیات سے مالا مال ہے اور یہی ان کے افسانوں کا سب سے بڑا وصف ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شبہ طراز کے افسانے افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک نئے ذائقے کا احساس دلاتے ہیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ تمام فنونِ لطیفہ انسانی جذبات و احساسات کو سیراب کرنے کا موجب بنتے ہیں اور شبہ طراز اس لحاظ سے قابل تکریم ہیں کہ انہوں نے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ مصوری کے فن میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے نثری و شعری افکار کی روشنی سے ہم آج بھی اپنے دلوں کی تاریکیاں دور کر سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ شبہ طراز اپنا تخلیقی سفر یہ سوچ کر جاری رکھیں گی کہ بقول آلِ رضا لکھنوی ؎

رُکے تو پاؤں پکڑ لے یہیں زمیں نہ کہیں
چلے چلو کہ وہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور...... ۱۶/ مارچ ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

'تیرے دیے ہوئے عذاب'، اور شاہد چودھری

ایک سوال ناقدین اور دانشوروں میں ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کہ تخلیق کار کی اصل حیثیت کیا ہے؟؟ مختلف عہد کے دانشمندوں نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ بعض دانشوروں اور فلسفیوں نے کہا ہے کہ تخلیق کار معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے لہٰذا اسے معاشرے کی تزئین و آرائش کے لیے اپنی جملہ صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ایک سچا تخلیق کار ہی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے سود مند ہو سکتا ہے۔ معاشرے کو تخلیقی اور تنظیمی سطح پر برباد کرنے والے افراد کی ایک کثیر تعداد ہر وقت موجود ہوتی ہے لیکن معاشرے کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے والے تخلیق کار کم کم ہوتے ہیں۔ یہ تخلیق کار بلاشبہ معاشرے میں ایک بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں اور اپنے طریقِ کار سے معاشروں کو حیاتِ جاوداں عطا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

شاھد چودھری نے اپنی شاعری میں اس صورتحال کو ایک نئے زاویے سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی ایک غزل کے صرف چار اشعار ملاحظہ فرمائیے:

لگتا ہوں گو میں عام سے انسان کی طرح
سچا ہوں اُس کے عشق میں قرآن کی طرح

جس دن وہ جا رہا تھا مجھے چھوڑ کر کہیں
میں تھا مہاجرین کے سامان کی طرح
جو شخص قلب و ذہن پہ چھایا رہا سدا
ہے میری داستان میں عنوان کی طرح
حصہ سمجھ لیا تھا جسے اپنے جسم کا
وہ شخص بھی گزر گیا انجان کی طرح

شاہد چودھری کا واضح مؤقف یہ ہے کہ آج کا قاری اپنے عہد کے تخلیق کار سے گریزاں بلکہ بدظن ہو چکا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اب تخلیق کار سطحی خیالات کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔ وہ قوم کوئی راہ دکھانے سے عاری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو خود وقت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے وہ تخلیق کار کسی کو کیا راہِ ہدایت دکھائے گا۔ اس سلسلے میں شاہد چودھری کا واضح مؤقف ملاحظہ فرمائیے:

وہ آپ بھول بھلیوں میں کھو گیا آخر
جو پیش پیش رہا راستہ دکھانے میں

علم و ادب کے پرستاروں کے لیے وہ لمحہ بہت اذیت ناک ہوتا ہے جب ادب و علم کے تخلیق کار باہم دست و گریبان دکھائی دیتے ہیں۔ نظریاتی سطح پر اختلاف کرنا تو کوئی بُری بات نہیں ہے مگر ذاتی مسائل کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے پر دشنام طرازی کرنا باعثِ ملال ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ اب ہم کسی نظریے کے نہ تو حامی ہیں اور نہ مخالف۔ جس وقت جو نظریہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوتا ہے ہم اسے اپنا لیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم آج تک اپنی سمت کا تعین نہیں کر سکے ہیں۔ اس بے سمتی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ پاؤں تو ہمارے چل رہے ہیں اور سفر کسی اور کا ہو رہا ہے۔ ذہن ہمارا استعمال کیا جا رہا ہے مگر فوائد نادیدہ قوتیں اٹھا رہی ہیں۔ دوسرے

لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ہم کسی اور کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بقول رئیس امروہوی

ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیسؔ
یہ کس کی عمر ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

یہ المیہ صرف تخلیق کاروں ہی کا نہیں ہے بلکہ من حیث القوم ہماری سمت متعین نہیں ہے اور اب تو ہماری راہیں بھی مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔ شاہد چودھری اپنے پہلے شعری مجموعے 'تین دیے ہوئے عذاب' میں ہر صاحبِ دل اور صاحبِ بصیرت سے استدعا کر رہے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قوم کی سمت نمائی کا فریضہ ادا کرے۔ آپ شاہد چودھری کی ایک غزل کے صرف تین اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کو ایک نئی سحر کے طلوع ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔

لہو کے دیپ جلاؤ نئی سحر کے لیے
کہ روشنی کی ضرورت ہے اپنے گھر کے لیے
وہ آشنائی وہ مانوسیت ملی ہی نہیں
ترس گئے ہیں یہاں آشنا نظر کے لیے
کوئی تو وادیٔ شب پر بھی آفتاب اُبھرے
اندھیرے دیر سے ہیں منتظر سحر کے لیے

یہ امر انتہائی المناک ہے کہ عصرِ حاضر میں ہمارے اندر سے قوّتِ برداشت کم ہوتے ہوتے بالکل نابود ہوگئی ہے۔ سیاست ہو یا مذہب، معاشرت ہو یا ادب ہر جگہ جذباتیت نے اپنے ڈیرے لگا لیے ہیں۔ اب تو ہمارے اندر سے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی ختم ہوگیا ہے۔ سیاست میں اقتدار کی ہوس کے باعث جذباتی ہوجانے کے معنی تو سمجھ میں آجاتے ہیں اور اسی طرح مذہب، معیشت اور معاشرت میں جذباتی روّیوں کی آبیاری تو صاحبانِ فہم و ذکا کی تفہیم کے لیے سہل ہے

لیکن کسی کا ادب کی اقلیم میں جذباتی ہو جانا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم شعروادب کے معاملات میں بھی جذبات کو ہر چیز پر مقدم قرار دے دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل ادب کے لیے انتہائی مہلک ہے۔ ادب نظریہ ساز ہوتا ہے۔ آپ کسی سے نظریاتی اختلاف کرتے ہیں تو یہ عمل مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ذاتی عناد کو ادب کے پردے میں چھپا کر پیش کرنا ادبی بددیانتی ہے۔ شاہد چودھری احساس دلاتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں عموماً اور ادب میں خصوصاً برداشت کو اہمیت دینا چاہیے تاکہ معاشرے میں شعروادب کی تخلیق کے لیے مناسب اور سازگار ماحول پیدا ہو سکے۔ اگر ہم نے اپنے سطحی اور مذموم مقاصد کے حصول کے لیے فنونِ لطیفہ کو استعمال کیا تو یہ عمل ہمارے لیے انتہائی نقصان دہ ہوگا اور ہم سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی ہر سطح پر ذلت کا شکار ہوتے چلے جائیں گے۔ آپ اُن کی غزل کے چند اشعار سنیے اور اس میں شاہد چودھری کی عصری حسیت دیکھیے اور معاشرتی کرب کو محسوس کیجیے:

ہے فرق اپنے پرائے میں، راج چہ معنی؟
تو گر خراب ہے قومی مزاج چہ معنی؟
ہمارے دیس کا قانون ہی عجب ہے تو
عدالتوں کے خلاف احتجاج چہ معنی؟
اسی لیے تو کنارے پہ ہیں تباہی کے
جو کام کل ہمیں کرنا تھا، آج چہ معنی؟
بُرائی جڑ سے نہ اُکھڑی تو امن لا حاصل
سنور بھی جائے یہ سارا سماج چہ معنی؟
جو دیس دنیا میں موسوم ہو زراعت سے
قطار میں کھڑے ہو کر اناج چہ معنی؟

یہ ملک عدل و مساوات کے لیے تھا لیا
پھر حکمران یہاں سامراج چہ معنی؟
معاشرے میں جو سرطان پھیل جائے تو
پھر اس کامل کے بھی شاہؔد علاج چہ معنی؟

شاہد چودھری کی شاعری میں علوئے فکر، تعمق، گہرائی و گیرائی، عصری حسیت، عالمگیریت اور شاندار اور ارفع اسلوب تلاش کرنا بیکار ہے ''تیرے دیے ہوئے عذاب'' دراصل ایک کھلنڈرے (Care free) کی شاعری ہے جو حالات و واقعات کو عمومی نگاہوں سے دیکھتا اور لوگوں کو دکھاتا ہے۔ وہ ایک ماہر سرجن کی طرح چیزوں کی چیر پھاڑ نہیں کرتا بلکہ ایک تماشائی کی طرح چیزوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ شاہد چودھری کا یہ عمل انتہائی دانشمندانہ ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح قاری پر اپنے خیالات مسلط نہیں کرتا بلکہ اُنہیں خود سوچنے اور سمجھنے کا موقع عطا کرتا ہے۔ چلتے چلتے میں ایک بات آپ پہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ شاہد چودھری کی شاعری کا مرکزی نقطہ حق گوئی اور سچائی کا علم بلند کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں سچ بولنا ہی سب سے بڑا عذاب ہے۔ شاہد چودھری نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ حق و صداقت کی عظمت بیان کی ہے اور اپنے اشعار کے ذریعے اہلِ عالم کو یہ پیغام دیا ہے کہ کامیاب و کامگار اقوام سچائی کے راستے پر رواں دواں رہتی ہیں اور اُن کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آتی۔ آپ شاہد چودھری کے شعری مجموعے 'تیرے دیے ہوئے عذاب' کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ ہمارے معاشرے کے تمام عذابوں کا سبب کذب وریا کو قرار دیتے ہیں۔ آپ شاہد چودھری کی درج ذیل غزل کا مطالعہ فرمائیے اور دیکھیے کہ ہمارے معاشرتی رویوں کو کتنی دانائی سے دیکھتے ہیں اور میرے نزدیک یہی طرزِ احساس شاہد چودھری کو ہم عصر شعرا میں ممتاز بنانے کا موجب ہے:

یہ سچ ہے، جھوٹ سے میں انحراف کرتا ہوں
تبھی ہر ایک کو اپنے خلاف کرتا ہوں

تری بس ایک ہی نیکی ہے جس کے بدلے میں
خدا نے مجھ سے کہا، جا معاف کرتا ہوں

منافقت کے لبادے میں جو نظر آئے
ہر ایسے فرد سے میں اختلاف کرتا ہوں

تُو بولتا ہے دلائل سے اور شواہد سے
تبھی تو تجھ سے میں لاف و گزاف کرتا ہوں

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ایک معتبر تخلیق کار معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے لہٰذا اُسے اپنی تخلیقات میں معاشرے کے تمام منفی اور مثبت رویوں کو سمونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ امر انتہائی خوش آئند ہے کہ شاہد چودھری نے اپنی غزلوں میں ہمارے معاشرے کے تمام منفی اور مثبت رویوں کو محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس طرح اُن کا شعری مجموعہ 'تیرے دیے ہوئے عذاب' ہمارے معاشرے کے قبیح و جمیل اعمال کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے اور میرے نزدیک یہی اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان کا یہ شعر میرے موقف کی تائید کے لیے کافی ہے۔

پسند آئے یا شاہدؔ کسی کو مت بھائے
میں جو بھی بات کروں، صاف صاف کرتا ہوں

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۱۶؍ستمبر، ۲۱؍اکتوبر، ۲۱ نومبر ۲۰۰۸ء)
(روزنامہ 'دن' لاہور......۳۰؍اگست ۲۰۰۸ء)

◆◆◆

◆◆◆

وحید عزیز کا شعری کارنامہ 'کوئی فاصلہ نہ ہو'

عصرِ حاضر میں ہمارے نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ''بے سمتی'' ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں ہے کہ ان کا سفر کس جانب ہے اور ان کی منزل مقصود کہاں ہے؟؟ غیر کے پاؤں سے اپنا سفر کرنے والے نوجوان آج کل شدید اذیت میں مبتلا ہیں۔ جملہ فنونِ لطیفہ سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ وہ دنیاوی شہرت وعظمت کے طلب گار ہیں اور سب سے زیادہ المناک بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو اخلاقی جادے سے ہٹانے والے تو سینکڑوں ہیں لیکن ان کی سمت نمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ اس ناگفتہ بہ حالت میں اگر کوئی نوجوان دنیاوی جاہ وحشمت، دنیاوی ہوا و ہوس اور شہرت کی خواہش ترک کر کے علم وادب کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف دکھائی دے تو حیرت ہوتی ہے اور وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آتی ہے۔ میرے خیال میں نوجوان تخلیق کار **وحید عزیز** ہمارے معاشرے میں رہتے ہوئے بھی ہمارے معاشرے کے نوجوانوں سے یکسر مختلف ہیں۔ وہ اپنے اساتذہ کا احترام بھی کرتے ہیں اور دوستوں کی کامیابی پر جشنِ طرب بھی مناتے ہیں۔ وہ والدین کی خدمت بھی کرتے ہیں اور بہنوں اور بھائیوں کے احکامات کی بجا آوری کو اپنا اولین فرض گردانتے ہیں۔ زمانہ لوگوں کو قیدی بناتا ہے لیکن لطف یہ ہے کہ وحید عزیز نے پورے زمانے کو اپنی محبت کا اسیر بنا رکھا ہے۔

پروفیسر وحید عزیز ایک علمی وادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ

کے والد گرامی پروفیسر عبدالعزیز مرحوم صاحب طرز استاد تھے۔ انگریزی زبان پر مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ مرحوم دینی تعلیم سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بیٹوں اور بیٹیوں کو دینی اور دنیوی تعلیم دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پروفیسر وحید عزیز نے معاشیات میں تعلیم حاصل کی اور درس و تدریس کا آبائی پیشہ اختیار کیا۔ معاشیات کے ایک بہترین استاد کی حیثیت سے وہ طلبہ و طالبات میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انہوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے اپنا ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم کر رکھا ہے جہاں وہ طلبہ و طالبات کو یہ احسن سبق پڑھا رہے ہیں کہ

تعلیم کی منزل کو دلیری سے کرو طے

رستہ میں جہالت کے پہاڑ آئیں تو ڈھادو

پروفیسر وحید عزیز کو کہانی کہنے اور سُننے کا بے حد شوق ہے۔ اسی شوق نے انہیں ادب کی راہ سجھائی اور انہوں نے درج ذیل دو ناول تخلیق کیے جنہوں نے بہت جلد عوام و خواص میں شہرت حاصل کر لی۔

(ا) گھر تو آخر اپنا ہے

(ب) تانیہ

''گھر تو آخر اپنا ہے'' میں انہوں نے کم عمری کے باوجود تقسیمِ برصغیر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے ایک دلچسپ کہانی کے ذریعہ یہ بات ثابت کی ہے کہ اب ہمیں اپنے گھر یعنی پاکستان کے تحفظ اور بقا کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہیے کہ اب پاکستان ہی ہمارا حقیقی گھر ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے ناول ''تانیہ'' میں ایک رومانوی کہانی بیان کر کے محبت کی لازوال فتح کو موضوع بنایا ہے۔ اگر ہم وحید عزیز کے ان دونوں ناولوں کا بغور مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں ناول ہمارے دو اہم سماجی روّیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلے ناول میں حب وطن اور دوسرے ناول میں

انسان دوستی کے مناظر جلوہ گر ہیں۔ اس طرح وحید عزیز ہمیں سبق دیتے ہیں کہ مہذب معاشروں میں صرف اپنے لیے زندہ نہیں رہا جاتا بلکہ کبھی کبھی دوسروں کے لیے بھی زندگی بسر کردی جاتی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ انسان کو ایک شجرِ سایہ دار کی مانند ہونا چاہیے جو سب کے لیے یکساں مفید اور فائدہ مند ہو۔

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

پروفیسر وحید عزیز صحافت کے میدان کے شہسوار بھی ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر چار سو سے زیادہ فیچر تحریر کیے ہیں جو ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور کے لیے بے شمار فیچر تحریر کیے جو علمی و ادبی اعتبار سے قابلِ قدر اور لائق صد تحسین ہیں۔ اسی طرح انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن اور دیگر پرائیویٹ چینلز کے لیے بھی بے شمار پروگرام وضع کیے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے ناظرین کی دلچسپی کا باعث بنے۔ انہوں نے بیسیوں تقاریب کی نظامت بہت اچھے طریقے سے کی اور ان تقاریب کو علمی و ادبی اعتبار سے قابلِ توجہ بنا دیا۔ اسی طرح وہ مختلف قومی اخبارات میں ''ایک لمحہ'' کے عنوان سے سیاسی، معاشی، سماجی، مذہبی اور ادبی موضوعات پر کالم بھی لکھتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی اسی آب و تاب سے جاری وساری ہے۔ وحید عزیز کے کالموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شخصی نمود و نمائش اور مخالفین کی دشنام طرازی سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے مسائل کا محض بے لاگ تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے مثبت تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کالم حق اور سچ کی بازگشت ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ سچائی کی خاطر ہر صعوبت اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ بقول اقبال

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کسی افسانوی تخلیق کار کے لیے شعر کہنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ناول اور افسانے میں کسی شخصیت کے چند نمائندہ رُخوں کو اُجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے جبکہ غزل کا ہر ایک شعر اپنی جگہ مکمل اکائی ہوتا ہے اور قافیہ ردیف اور بحر کے ذریعہ اسے اپنے دیگر ساتھی شعروں کا ہاتھ بھی تھامے رہنا پڑتا ہے۔ اُردو میں غالب وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ غزل کے ہر شعر کو ایک مکمل اپی سوڈ بنا کر اپنے قاری کو متحیر کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس طرزِ عمل کے باعث ان کے قاری کو جو تسکین حاصل ہوتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ آپ غالب کا یہ شعر پڑھیے اور دیکھیے کہ کیا یہ اپنی جگہ پر ایک مکمل ''یک بابی ڈرامہ'' نہیں ہے۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اسی طرح آپ اردو فکشن میں ممتاز مفتی کا مطالعہ فرمالیجیے۔ آپ عمیق نگاہی سے دیکھیں تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ان کے افسانے بنیادی طور پر ''کیس ہسٹری'' ہوتے ہیں۔ اگر آپ غالب کے یک بابی ڈراموں اور ممتاز مفتی کے افسانوں کا امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں تو پروفیسر وحید عزیز کی شاعری کا مطالعہ کرلیجیے۔ ''**کوئی فاصلہ نہ ہو**'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ضرور ہے لیکن اس میں ان کی گزشتہ نثری مشاقی کو خصوصی دخل ہے۔ انہوں نے غالب کی طرح صرف ایک جزوی واقعہ کو شعر کا بھرپور روپ دینے کی شعوری کوشش کی ہے۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا عمیق نگاہی سے مطالعہ فرمائیے تو آپ کو یہ بھی ''یک بابی ڈرامے'' محسوس ہوں گے۔

تو گیا تو روشنی بھی مجھ سے رخصت ہوگئی
خانۂ دل میں مرے اب شمع جلتی بھی نہیں

....

جن کو غرور تھا کبھی، خود پر گھمنڈ تھا
پھرتے ہیں مارے مارے وہ احباب دیکھنا

....

خون ہوتی ہیں کیا تمنائیں
اے خدا، دکھ ذرا بشر کے تو دیکھ

....

اس نے دیکھا جو مسکرا کے مجھے
آئینے میں کوئی نہ بال رہا

....

سارے تکلفات پس پشت ڈال کر
ایسے گلے لگاؤ، کوئی فاصلہ نہ ہو

....

پروفیسر وحید عزیز محبت کے پرچارک ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات میں وطن سے محبت اور انسان سے دوستی بنیادی اور مرکزی نکتہ ہے۔ وہ شاعری میں بھی محبت کا ایک ایسا چراغ روشن کرنے کے متمنی ہیں جس کی روشنی پوری کائنات کے در و بام کو جگمگا دے۔ انہیں علم ہے کہ محبت کا دیا تند و تیز ہواؤں سے بھی نہیں بجھ سکتا۔ وہ اہلِ عالم پر واضح کرتے ہیں کہ انہیں ایوان محبت میں تلاش کیا جائے کہ اب وہ مکمل طور پر وہیں مقیم ہیں۔

جہاں جہاں بھی محبت ہے میں وہیں ہوں گا
کسی طرح نہیں ممکن مٹا دیا جاؤں

وحید عزیز کی شاعری کا مرکزی نکتہ بھی محبت اور اس کے متعلقات ہیں۔ وہ ہجر و وصال کی باتیں بھی کرتے ہیں اور محبت کی وعدہ شکنی پر احتجاج کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ محبوب کی گلی کے چکر بھی لگاتے ہیں اور رقیبوں پر اس کی بے جا التفات کا شکوہ بھی کرتے

ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ محبت کے تمام کلاسیکی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ تو دیتے ہیں لیکن اس میں اپنے خون جگر سے ندرت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے اور ان میں محبت کی مہک محسوس کیجئے۔

تو نہیں تیری گلی بھی اب نہیں جانِ عزیزؔ
کس لیے پھر دل کی یہ دھڑکن سنبھلتی ہی نہیں

سمجھاؤں اس کو راز محبت کے میں عزیزؔ
تنہا اگر وہ مجھ کو کبھی بے وفا ملے

....

مجھ سے جدا ہوا تھا وہ جب یاد ہے مجھے
ویراں، اُداس موسم شب یاد ہے مجھے

....

ہائے اک اجنبی کو ہم اپنے
دل کے گھر کا مکیں سمجھنے لگے

....

میرے ہمراہ کڑی دھوپ میں چلتا کیسے
چھوڑ کر راحتیں، اشکوں میں وہ ڈھلتا کیسے

....

اک عمر سے ہوں میں اسی لمحے کا منتظر
جب تم یہ گنگناؤ کوئی فاصلہ نہ ہو

....

وحید عزیز کی شاعری میں نہ تو میر تقی میر کی طرح دلسوزی ہے، نہ غالب کی طرح تعمق و تفکر اور نہ اقبال کی طرح فلسفیانہ نظام حیات لیکن اس کے باوجود ان کی

غزلوں میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو پڑھنے والے کے دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور شاید یہ ان کی انفرادیت ہے۔ وہ دوسرے شعرا کی طرح منفرد موضوعات کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہتے بلکہ عام موضوع سے خاص بات وضع کرنے کی کاوش کرتے ہیں۔ ان کا یہ طریقۂ کار دقیق بھی ہے اور منفرد بھی۔ آپ ان کے درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وحید عزیز نے کتنی سادگی سے عام باتوں کو خاص بنا دیا ہے۔

ٹوٹ جانے میں کیا اذیت ہے
میری صورت، کبھی بکھر کے تو دیکھ

....

نہ لگتا بوجھ مجھے اپنا یہ وجود اگر
تری نگاہ کے اندر سمٹ گیا ہوتا

....

سرِ نوکِ سناں، سر دیکھنا ہے
اب ایسی موت مر کر دیکھنا ہے

....

اس کے نگر کی سمت ہے خلقت اُمڈ پڑی
اب اس کے کتنے کھلتے ہیں ابواب دیکھنا

....

اس کے سانچے میں ڈھل کے بھی اپنے
قد و قامت کو میں نے کم نہ کیا

....

وحید عزیز کی غزلوں کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس میں ہمارے معاشرے کی زندہ اور متحرک کہانیاں جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں۔ وہ معاشرے کے بہترین نباض ہیں

اور ہر اس سماجی مسئلے کی طرف توجہ دیتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے لیے ناسور بن چکا ہے۔ آپ ان کی درج ذیل غزل کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ اس میں انہوں نے ہمارے معاشرے کے ان تمام رُخوں پر روشنی ڈالی ہے جس سے ہم آج نبرد آزما ہیں۔

اب شہرِ رنگ و نور میں کانٹوں کا راج ہے
افسوس ظالموں کے سروں پر ہی تاج ہے
فصلِ امید خون سے جو سینچتا ہے دوست
محتاج دانے دانے کا وہ کل اور آج ہے
ظالم کی آج مدح سرائی ہے ہر طرف
کیسا یہ دور، کیسا یہ اپنا سماج ہے
اک جھوٹ ہے جو اپنی رگِ جاں میں ہے رواں
لگتا ہے اب یہ اپنا مرض لاعلاج ہے
اک سمت ہے عروج پہ غربت یہاں عزیزؔ
اک سمت بے بہا وہاں غلہ اناج ہے

اس غزل کے علاوہ بھی ''**کوئی فاصلہ نہ ہو**'' میں بے شمار ایسے اشعار بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں جو ہماری سماجی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ اخلاقی اقدار کے زوال کا رونا بھی روتے ہیں اور ہمارے اندر جنم لینے والی عصبیتوں کا سراغ بھی لگاتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کے باعث پروفیسر وحید عزیز ایک ایسے شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو سماج میں رہ کر کھلی آنکھوں سے معاشرے کے خدوخال سے ہمیں روشناس کرانے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ آپ درج ذیل اشعار کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ وہ اپنے معاشرے کو کس عمیق نگاہی سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

ہجر کی شب ہے کہ ڈھلنے سے بھی ڈھلتی ہی نہیں
صورتِ حالات کیسی ہے بدلتی ہی نہیں

....

خود منصف خود قاتل ہیں ہم
حق ہو کر بھی باطل ہیں ہم

....

سکوں سے جیتے زمانے میں ہم تری صورت
خلوص دل سے کسی طور گھٹ گیا ہوتا

....

انساں تھے جس قدر وہ سبھی دیوتا ملے
اس شہرِ بد لحاظ میں کتنے خدا ملے

....

چاند چہرہ اور زلفوں کو گھٹا کہتے رہے
حبس تھا وہ شخص اُس کو ہم ہوا کہتے رہے
کھو گیا تھا اس لیے ساری دعاؤں کا اثر
ناخداؤں کو جہاں والے خدا کہتے رہے

....

تمام شہر ہے حرص و ہوا کے چکر میں
وہ کون تھا کہ جو رزقِ حلال چھوڑ گیا

درج بالا اشعار کو پڑھنے کے بعد اگر کسی کے وہم وگمان میں یہ بات آ جاتی ہے کہ وحید عزیز کی شاعری پانی پر نقش ثابت ہوگی تو وہ وحید عزیز کا یہ موقف پیش نگاہ رکھے کہ۔

میں گزرا وقت نہیں ہوں بھلا دیا جاؤں
سحر کا دیپ نہیں جو بجھا دیا جاؤں

پروفیسر وحید عزیز نے نثر و شعر دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی جدّت طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے ناولوں اور غزلوں میں معاشرے کے متنوع رنگ و روپ اُجاگر ہوئے ہیں تاہم انہیں فخر ہے کہ اس بے کمال دنیا میں ان کا نام محض شاعری کی بدولت زندہ و پائندہ رہے گا ؎

میری اوقات کچھ نہیں ہے عزیز
شاعری گر مرا کمال نہ ہو

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ عصرِ حاضر کے نوجوان اپنے آباؤ اجداد کی اخلاقی میراث کو چھوڑ کر دنیاوی لہو ولعب میں مبتلا ہو کر ''بے سمت'' ہو گئے ہیں۔ تساہل، آلکسی اور بے عملیت ان کا شعار ہے، تاہم نوجوان تخلیق کار وحید عزیز نے اپنے اسلاف کی میراث کا تحفظ کیا ہے اور اس کے فروغ کے لیے حرف و لفظ سے ناتا جوڑ کر نوجوانوں کے ذہنوں پر دستک دی ہے اور انہیں احساس دلایا ہے کہ اس بھاگ دوڑ کی دنیا میں وہی قومیں کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہیں جو معاشرے میں مثبت اقدار کے فروغ کے لیے اپنے ممکنہ وسائل بروئے کار لائیں۔ اُمید ہے کہ پروفیسر وحید عزیز اسی تندہی، محنت اور لگن سے گلستانِ ادب و صحافت کی آبیاری کرتے رہیں گے۔ ہماری دعا ہے کہ ؏

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۶ راگست ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور......۳۱ مارچ تا۲ راپریل ۲۰۰۹ء

◆◆◆

◆◆◆

اُجلے من کا نقاد۔ قدرت اللہ شہزاد

عصر حاضر میں ہماری زبان کا رشتہ سماجی علوم سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ زبان کے حوالے سے ہماری ترجیحات روز بروز بدلتی ہوتی جا رہی ہیں۔ ساری دنیا میں لسانیات کو سائنس کا درجہ مل چکا ہے مگر ہم لوگ ہنوز تلفظ کے دائرے میں اپنی ذہانتوں کو دوڑا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کے ارتقا سے ہم کسی بھی تہذیب کی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ زبان کے بارے میں غیر سنجیدہ رویے کے باعث ادب سے بھی ہمارا ناتا کمزور ہو چکا ہے۔ آج کا نوجوان سوال کرتا ہے کہ ہمیں اردو زبان و ادب پڑھ کر کیا ملے گا......؟؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں زبان کی ترقی اور بہبود کے لیے اُردو کو معیشت سے جوڑ دینا چاہیے۔ نئی ٹیکنالوجی سے آشنائی اردو زبان کو جدید عہد سے پیوستہ کر دے گی اور نوجوان نسل اس زبان کو اپنانے میں فخر کرے گی۔ اگر ہم اسی تذبذب کا شکار رہے تو ہماری نوجوان نسل اردو زبان اور ادب سے لاتعلق ہو کر کسی غیبی زبان سے مدد کی خواستگار ہو جائے گی۔

یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ ہمارے بعض صالح نوجوان دنیاوی حرص و آز کو پیچھے چھوڑ کر شعر و ادب کی بستی بسانے میں مصروف ہیں۔ وہ گوشہ گیر ہو کر ادب کے فروغ کے لیے اپنے ممکنہ وسائل بروئے کار لاتے ہیں اور اپنے زرخیز افکار سے اقلیم

ادب کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہیں۔ ایک ایسے ہی اُجلے من کے نوجوان تخلیق کار **قدرت اللہ شہزاد** بھی ہیں جنہوں نے بہت کم عرصے میں تحقیق، تنقید اور تخلیق کے میدان میں خوب خوب نام کمایا ہے۔ قدرت اللہ شہزاد بہاول پور کے ایک علمی وادبی خانوادے میں سید محمد رب نواز کے گھر پیدا ہوئے۔ شہزاد نے یہیں اپنی تعلیم مکمل کی اور صادق پبلک سکول بہاولپور میں اردو زبان وادب کی تدریس میں منہمک ہو گئے۔ مقامی اخبارات دستور، ستلج اور سیادت کی ادارت کی اور کئی معروف وغیر معروف اخبارات میں کالم نویسی کے جوہر بھی دکھائے۔ آج کل بہاولپور کی معروف ادبی تنظیم ''مجلس سخن'' کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ انہوں نے اپنے ہم عمر تخلیق کاروں کی طرح شاعری کر کے محض داد نہیں سمیٹی بلکہ اپنے افکار ونظریات کو خونِ جگر سے سینچا ہے اور قارئین کو نجم آفندی کی زبان سے یہ کہہ کر درج ذیل چھ تصانیف تحفتہً پیش کی ہیں۔

حق ناشناس میرے مخاطب نہیں ہیں نجم
خودداریِ سخن کو سخندان سے کام ہے

۱) جلتے بجھتے سورج (خاکے)
۲) اُجلے من کے لوگ (شخصیت نامے)
۳) صحرا چمکتا ہے (تنقید)
۴) آپ بیتی کے توانا لہجے (تنقید)
۵) اُردو کے چند خاکہ نگار (تنقید)
۶) شہاب دہلوی کے شعری رویے (تنقید)

درج بالا کتب کے عمیق مطالعے کے بعد ہم قدرت اللہ شہزاد کے تمام کارناموں کو درج ذیل دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(ا) بطور محقق ونقاد

(ب) بطور تخلیق کار

اب ذیل میں ان دونوں رُخوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ تنقید کسی نئی شے کی بازیافت کا نام ہے اور بڑا نقاد اپنی بصیرت و بصارت کو استعمال میں لاکر ادبی شہ پارے میں سے نیا جہانِ معنی تلاش کرتا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ ہر ناقد کسی خاص معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے اور وہاں کے معاشرتی، مذہبی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی رویے اس کے تنقیدی مزاج کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ قدرت اللہ شہزاد نے بھی اپنی تحقیق اور تنقید کے لیے جو باوقار اصول وضع کیے ہیں۔ وہ ان کی جودتِ طبع اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں۔ انہوں نے ایک جانب تو اہم اور غیر اہم شخصیات کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنایا ہے اور دوسری جانب علمی و ادبی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ انہوں نے بعض اہم کتب اور رسائل پر تبصرے بھی کیے ہیں۔ اس طرح ان کا ذہنی کینوس قارئین کو متحیر کرنے کا موجب بنتا ہے۔ قدرت اللہ شہزاد نے شوکت علی شاہ کی سفرنامہ نگاری، علی احمد رفعت کی غزلوں میں سیاسی رنگ، عطاءاللہ اعوان کی خاکہ نگاری، انیس قمر کی شاعری میں گلۂ احباب، قاسم جلال کا تصور شعر و ادب، اقبال صدیقی کی شعر گوئی اور شہاب دہلوی کی اداریہ نویسی پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ان تمام احباب کے شعری و نثری کارناموں کو التزام سے سپردِ قلم کیا ہے۔ ان تخلیق کاروں سے قدرت اللہ شہزاد کو عشق ہے کہ یہ ان کی جنم بھومی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دراصل شہزاد نے اپنے مضامین کے ذریعہ ان تمام تخلیق کاروں پر پڑی ہوئی گمنامی کی گرد صاف کی ہے اور ان کے لیے شہرت کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر شہزاد اپنی مٹی کا یہ قرض ادا نہ کرتے تو تمام احباب مل کر انیس قمر کی طرح اہلِ نقد و نظر سے یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوتے کہ۔

اے دیکھنے والے ہمیں عبرت کے لیے دیکھ
ہم چوک میں لٹکی ہوئی لاشوں کی طرح ہیں

قدرت اللہ شہزاد نے معروف آپ بیتیوں کا مطالعہ بھی کیا اور ان کے بعض فکر انگیز پہلوؤں کی جانب ہماری توجہ مرکوز کرائی۔ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کی ''آپ بیتی'' زیڈ۔اے۔ بخاری کی ''سرگزشت'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ''یادِ عہد رفتہ''، آل احمد سرور کی ''خواب باقی ہیں''، اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، مظفر وارثی کی ''گئے دنوں کا سراغ'' ڈاکٹر جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک'' ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی''، کشور ناہید کی ''بُری عورت کی کتھا'' اور قمر علی عباسی کی ''ایک عمر کا قصہ ہے'' کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کے درمیان بعض مماثلتوں اور اختلافات کو اُجاگر کرنے کی بلیغ سعی کی ہے۔ انہوں نے ان آپ بیتیوں میں موجود توانا لہجوں کو دریافت کیا ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری منصفانہ تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ شہزاد کے ان مضامین کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے محض ان آپ بیتیوں کی مدح وستائش ہی نہیں کی بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول بعض سوانح عمریوں میں زبان اور لہجے کی ضعیفی کی طرف ایک صاحبِ نظر نقاد کی طرح اشارے بھی کیے ہیں۔ یہ مضامین قدرت اللہ شہزاد کی وسعت مطالعہ پر دال ہیں۔

قدرت اللہ شہزاد نے اُردو کے معروف و غیر معروف خاکہ نگاروں پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ یہ بات واقعی قابل توجہ ہے کہ ناقدین کی یہی عدم توجہی شہزاد کی خاکہ نگاری کی جانب توجہ کا سبب بن گئی۔ انہوں نے عبدالمجید سالک، مالک رام، ڈاکٹر عبادت بریلوی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، حمیدہ اختر رائے پوری، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر آفتاب احمد، اے حمید، ابوالفضل صدیقی، عطاالحق قاسمی، یونس جاوید اور محمود علی کے خاکوں کے عیوب و محاسن پر کماحقہٗ روشنی ڈالی ہے اور اپنی

تنقیدی استعداد کے مطابق ان کے مقام و مرتبے کے تعین کی کاوش کی ہے۔ یہ ان بزرگ ہستیوں سے تمسک کا فیض ہے کہ قدرت اللہ شہزاد کا نام تحقیق و تنقید کے فلک پر روشن ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔

قدرت اللہ شہزاد محقق اور نقاد کے ساتھ ساتھ تخلیق کار بھی ہیں۔ انہوں نے ''جلتے بجھتے سورج'' کے عنوان سے بہاولپور سے تعلق خاطر رکھنے والی معروف علمی و ادبی شخصیات کے خاکے انتہائی فنی چابک دستی کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔ ان شخصیات میں سید ہاشم رضا، علامہ رحمت اللہ ارشد، مرتضیٰ بیگ برلاس، بشریٰ رحمن، سید تابش الوری، مولانا عبدالقادر آزاد، ڈاکٹر مصباح العین خان، پروفیسر منور علی خان، پروفیسر محبوب الٰہی، امجد قریشی، نعیم اختر مرزا، خورشید ناظر، منور جمیل قریشی، نوشی گیلانی اور منور عثمانی شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شہزاد نے اپنے تمام ممدوحین کو تخلیق کی تیسری آنکھ سے دیکھا ہے اور اسی لیے ان خاکوں میں بقول اشفاق احمد سچائی اور سادگی کے چراغ روشن دکھائی دیتے ہیں۔ قدرت اللہ شہزاد نے ''اُجلے من کے لوگ'' میں بہاولپور کے اہل اللہ کے خاکے بھی بڑی عقیدت و احترام سے لکھے ہیں۔ نمود و نمائش سے دور اور تشہیر سے احتراز کرنے والے ان اصحاب جلیلہ کی زندگی کے چند اوراق ہمارے سامنے لانے کا سہرا بھی قدرت اللہ شہزاد کے سر ہے۔

قدرت اللہ شہزاد کی تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا حقیقی اندازہ صرف وہی شخص لگا سکتا ہے جو ان کی تمام تصنیفات و مرتبات کا کماحقہٗ مطالعہ کرے۔ ان کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت کی طرح سچا، کھرا اور سادہ ہے۔ انہوں نے جس چیز کو جیسا محسوس کیا ویسا ہی پیش کر دیا اور یہی ان کے اخلاص کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اپنے موضوعات و اسالیب کے باعث قدرت اللہ شہزاد کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ

عصرِ حاضر میں ہمارے نوجوان ادب سے لاتعلق ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نوجوانوں میں ادب وشعر کا ذوق پیدا کریں اور انہیں احساس دلائیں کہ شعروادب سے تمسک رکھ کر وہ دنیا میں ایک بلند مقام بنانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم ان نوجوان تخلیق کاروں کی پذیرائی کریں جو اس ادب کش معاشرے میں بھی علم وادب کا پرچم اٹھائے رواں دواں ہیں۔ قدرت اللہ شہزاد اس لحاظ سے قابل تحسین اور لائق ستائش ہیں کہ انہوں نے بہاولپور جیسے دورافتادہ علاقے میں رہ کر بھی شعروادب کے چراغ کو اپنے خون جگر سے فروزاں رکھا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عزم وہمت عطا کرے تاکہ وہ اسی حکمت وتندہی سے علم وادب کی آبیاری کرتے رہیں۔ میں تو شہاب دہلوی کے اس شعر پر اپنے معروضات مکمل کرتا ہوں کہ ؎

مرا کیا ہے، میں ہر وعدہ ترا برحق سمجھتا ہوں
وہ کوشش کر کہ جس کوشش سے دل کو اعتبار آئے

مطبوعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور...... ۱۹ مارچ ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور...... ۲۰ مارچ ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'خبریں' ملتان...... ۳ اپریل ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

◆◆◆

ایک مہذب شاعرہ۔ الویرا یاسمین علی

دانش مندوں نے شاعری کو انسانی جذبات سے منسلک کر کے اہلِ باطن پر یہ راز منکشف کر دیا ہے کہ وفورِ جذبات کی بدولت ہی بڑی شاعری وجود میں آسکتی ہے۔ اس مغالطے کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعری محض جذبات کی عکاس قرار پائی اور فنی رموز کہیں دھند میں کھو گئے۔ میرے خیال میں شاعری بلکہ تمام فنونِ لطیفہ جذبات اور فن کے حسین امتزاج سے وجود میں آتے ہیں۔ جذبات جتنے ارفع ہوں گے شاعری کی سطح اتنی ہی بلند ہوگی۔ جذبات کی مثال ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے دی جا سکتی ہے۔ اس بے قابو سمندر کو فن کی سختیاں ہی قابو کر سکتی ہیں۔ اگر کوئی شاعر جذبات سے مالا مال ہو مگر فنی رموز سے بے بہرہ ہو تو وہ اچھا شاعر ہرگز ہرگز نہیں بن سکتا ہے۔ شاعری کو برباد کر دینے والے سینکڑوں اسقام ہیں اور عصرِ حاضر کی برق رفتار زندگی میں ان سے کما حقہ آگاہ ہونا نوجوان شعرا کے لیے ناممکن ہے تاہم دو شعری عیوب پر نگاہ رکھ کر ''عمومی'' شاعر بھی ''خصوصی'' بن سکتا ہے۔ پہلی چیز اوزان و بحور پر دسترس ہے اور دوسری چیز کسی لفظ کو درست تلفظ کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔ میرے خیال میں اگر نوجوان شعرا محض ان دونوں نکات پر توجہ فرما لیں تو ان کی جذبات سے پُر شاعری قابلِ قدر اور لائق ستائش ہو سکتی ہے کیونکہ بقول شاعر:

شاعری کھیل نہیں ہے جسے بچے کھیلیں
دل نچڑ جاتا ہے صدمات کے سہتے سہتے

ہم ایک ایسے پُرفتن معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ''عورت'' کی حیثیت ضمنی ہوکر رہ گئی ہے۔ اقبال تو عورتوں کو انگریزی پڑھتے دیکھ کر دل گرفتہ ہوگئے تھے لیکن ہم لوگ تو ان سکولوں اور کالجوں کو بھی بموں سے اڑا رہے ہیں جہاں لڑکیاں عربی اور اردو پڑھنے کی متمنی ہیں۔ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟؟ میرے خیال میں صرف اور صرف ہماری گھٹیا سوچ اور ترقی کرتی ہوئی عورت کا خوف۔ آپ کسی بھی مہذب معاشرے کا مطالعہ فرمالیجیے آپ دیکھیں گے کہ اس کی تعمیر وتشکیل میں عورت اور مرد کا کردار مساوی رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد تنظیم اور عورت تخلیق کا استعارہ ہے۔ آپ دنیا کی تمام بڑی تہذیبوں کا مطالعہ کرلیجیے اور اس سوال کا کھوج لگایئے کہ کیا کوئی تہذیب تخلیق کو چھوڑ کر محض تنظیم کی بدولت عظمت سے ہمکنار ہوسکتی ہے......؟؟ آیئے آج ہم صدقِ دل سے یہ مصمم ارادہ کریں کہ تنظیم اور تخلیق کی آمیخت سے ہم ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں گے جس میں ہر ہنرمند کو اس کا جائز مقام عطا کیا جائے گا اور خصوصاً ہم خواتین تخلیق کاروں کے لیے دل میں چھپی ہوئی نفرت کو اُلفت میں تبدیل کرکے ''برگِ دل'' کی شاعری **الویرا یاسمین علی** کا یہ شکوہ دور کردیں گے کہ

نفرت سے مجھ کو دیکھنے والے کبھی تو سوچ
چاہا تھا کتنا میں نے تجھے ٹوٹ ٹوٹ کر
الویرا دل کا حال تھا چہرے سے بھی عیاں
ریزے بکھر گئے تھے مرے ٹوٹ پھوٹ کر

الویرا یاسمین علی نے اپنے جگر لخت لخت کو ''**برگ دل**'' کے عنوان سے یکجا کیا ہے۔ اس شعری مجموعہ کا عنوان بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا سادہ سا مطلب تو ہے ''دل

کی پتیاں''، مگر اس میں ایک نکتہ یہ بھی پوشیدہ ہے کہ ان کا گلاب دل اب پنکھڑیوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ذاتی آلام یا معاشرتی آشوب۔ اس مجموعے کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ **الویرا یاسمین علی** جہاں ایک طرف ذاتی دُکھوں کا شکار ہیں وہاں دوسری جانب حساس قلب ونظر کے باعث وہ بگڑتے معاشرتی رویوں سے بھی دل برداشتہ ہیں۔ عام طور پر ذاتی مسائل اور معاملات کی پیش کش میں ہماری شاعرات احتیاط برتتی ہیں لیکن الویرا ایک صاف باطن اور حق گو شاعرہ ہیں وہ اپنی پوری زندگی کا احاطہ کر کے اعلان کر دیتی ہیں کہ

تو ہی تو نکلا ضربوں تقسیموں سے
جب بھی حساب کیا ہے بیتے لمحوں کا

الویرا یاسمین علی نہ تو فہمیدہ ریاض کی طرح بیباک شاعرہ ہیں اور نہ کشور ناہید کی طرح نڈر۔ وہ تو پاک باطن شاعرہ ہیں کہ ہجر و وصال کے قصے بھی حجابوں میں پیش کرنے کی عادی ہیں۔ وہ تو محبوب کے دل میں بھی آہستہ روی کے ساتھ اترنے کی متمنی ہیں۔

مجھ کو آس ہے اس کے دل میں اتروں گی
گر اس کا اندازِ نظر پتھر کا نہیں

الویرا کی شاعری میں غمِ دوراں بھی ہے اور غمِ جاناں بھی مگر اظہارِ غم میں ایک ''تہذیب'' ہے۔ دراصل یہ تہذیب ان کی مہذب شخصیت کی غماز ہے۔ وہ اپنے غموں پر دوسری شاعرات کی طرح نہ تو چیختی ہیں اور نہ برہمی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے اظہارِ غم میں بھی ایک سلیقہ ہے جو ان کی عمر بھر کی ریاضت کا ثمر ہے۔ آپ ان کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے:

پتھر کھنگالنے میں مری عمر کٹ گئی
خود کو سنبھالنے میں مری عمر کٹ گئی

پاتا رہا سکوں وہ مرا غم اچھال کر
آنچل سنبھالنے میں مری عمر کٹ گئی

اُس نے تو پھول پھینکے تھے میری طرف مگر
کانٹے نکالنے میں مری عمر کٹ گئی

آ دیکھ میری آنکھ کے بجھتے ہوئے چراغ
ہاں غم کو پالنے میں مری عمر کٹ گئی

کیا جانے میرے دل میں وہ اترا تھا کب جسے
دل سے نکالنے میں مری عمر کٹ گئی

اک بار زندگی میں وہ میرا ہوا تھا بس
وہ پل سنبھالنے میں مری عمر کٹ گئی

الویرا زندگی پہ مسلط ہوئی وہ شب
جس شب کو ٹالنے میں مری عمر کٹ گئی

الویرا کی شاعری میں ہم عصر معاشرتی رویوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ وہ غربت سے افسردہ اور احباب کے منافقانہ طرزِ عمل سے غمگین ہیں۔ وہ باغ پر مسلط ہو جانے والی خزاں سے دل گرفتہ اور عدالتی ناانصافی سے کبیدہ خاطر ہیں۔

ہوئے منتشر یوں بہاروں کے میلے
گلستان اپنے مکیں ڈھونڈتے ہیں

اس ابتر صورت حال میں بھی الویرا مایوس نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ چراغِ اُمید روشن کرتی ہیں اور آنے والے خوشگوار زمانے کی نوید سناتی ہیں۔ الویرا آلامِ روزگار کو غمِ جاناں میں گھلا ملا کر اسے سہل بنا دیتی ہیں۔ اسی لیے وہ دنیا کی رعنائیوں کو چھوڑ کر محبوب کی پناہ میں آ جاتی ہیں۔

مجھے بھی رونق دنیا پسند ہے لیکن
ترا خیال مجھے کب رہائی دیتا ہے

الویرا یاسمین علی محبت میں اپنا سب کچھ والہانہ انداز میں قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ انہیں بخوبی علم ہے کہ اگر انہوں نے یا ان کے محبوب نے محبت جیسے مقدس رشتے کو پامال کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ آج کے دور میں عاشق و محبوب دونوں ہرجائی ہیں لیکن الویرا اپنے محبوب پر یہ بات آشکار کر دیتی ہیں کہ

سانس سانس کو اپنی اک وبال پاؤ گے
ہاں مرے بنا جینا تم محال پاؤ گے
میں تو ریزہ ریزہ ہوں اور تم بہت نازک
مجھ کو کس طرح آ کر تم سنبھال پاؤ گے
تم نے اپنی آنکھوں میں تو پناہ دے دی ہے
میرا درد سینے میں کیسے پال پاؤ گے
ڈوب کر تو الویرا دیکھو پیار ساگر میں
تم بھی درد کا موتی لازوال پاؤ گے

'برگ دل' الویرا یاسمین علی کا پہلا شعری مجموعہ ہے لہٰذا اس کا موازنہ دیوانِ غالب سے کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک شاعرہ کے قلبی جذبات ہیں جنہیں اس نے شعری روپ عطا کرنے کی کاوش کی ہے۔ نہ وہ میر و غالب کی ہم سر ہونے کی دعوے دار ہے اور نہ وہ اپنے فن پر نازاں ہے۔ اس نے تو اپنے دل کی قاشیں ہمارے سامنے رکھ دی ہیں، آپ چاہیں تو انہیں مَسل دیں اور چاہیں تو ان کی سوندھی سوندھی خوشبو سے اپنے قلب و اذہان کو معطر کر لیں۔ اس شعری مجموعے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں اغلاط ہوں گی مگر

میں بد بیں نقاد نہیں ہوں کہ دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھوں۔ میرے اساتذہ اور بزرگوں نے تو مجھے یہی سکھایا ہے کہ میں اپنی خامیوں اور دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھتا ہوں کیونکہ بدبیں و بدخواہ نقاد بقول جوش ملیح آبادی۔

آفاق کے ہر نور کو دھندلاتا ہے
کونین کی ہر آگ کو کجلاتا ہے
مہتاب میں دھبے ہیں، گلوں میں کانٹے
بدبیں کو بس اتنا ہی نظر آتا ہے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شاعری جذبات و احساسات کی تطہیر کا نام ہے۔ اگر کوئی شاعر فنی رموز سے آگاہی کے بعد اپنے جذبات کو شعری پیرائے میں پیش کرتا ہے تو اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ الویرا یاسمین علی نے عصرِ حاضر کے مردانہ معاشرے میں مہذب نسائی جذبات کی جس طرح پیش کش کی ہے اس کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ اگر ہم نے گزشتہ ادوار کی طرح عورتوں کی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کیا اور انہیں محض امورِ خانہ داری تک محدود رکھا تو آنے والا زمانہ ہمیں معاف نہیں کرے گا اور تمام شاعرات **الویرا یاسمین علی** کی زبان سے یہی شکوہ کریں گی کہ

قدر دان ہیں کتنے، اپنے محسنوں کے ہم
سنگِ ظلم بھی ان کے سب سنبھال رکھے ہیں

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۳۰ مارچ ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

•••

حرکت وعمل کا استعارہ۔ محمد آصف وٹو

اللہ تعالیٰ کی احسن مخلوق انسان کے تین حصے بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہوتے ہیں۔ بچپن کم عقلی اور بڑھاپا بے عملی میں بسر ہو جاتا ہے صرف اور صرف جوانی کا زمانہ انسان کے اندر تحرک اور عمل بیدار کرتا ہے اور انسان میں کچھ کرنے کا عزم وحوصلہ پیدا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کا مرکز ومحور بھی یہی جوان ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی جوانوں کی ادائیں پسند ہیں اسی لیے جوانی کی عبادت کا درجہ بلند رکھا گیا ہے۔ جوانوں سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ کی بنائی ہوئی جنت میں صرف اور صرف جوان ہی ہوں گے۔

جوانی کا زمانہ انسان کی عمرِ عزیز کا سب سے پرلطف زمانہ ہوتا ہے۔ وہ اس دور میں عزم وہمت کا کوہسار ہوتا ہے۔ ستاروں پہ کمندیں ڈالنا اس کا شیوہ اور زمین کی پاتال تک پہنچ جانا اس کا وتیرہ ہوتا ہے۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے اور بلند قامت پہاڑوں سے جوئے شیر کھینچ کر لے آتا ہے۔ اگر اس کی تحقیق وجستجو آگے بڑھے تو وہ ذرے کا دل چیر کر اس میں سے کائنات دریافت کر لیتا ہے۔ وہ ہواؤں کو مسخر کر لیتا ہے اور اپنی جوانی کے زور سے قطرے کو چیر کر سمندر بنا دیتا ہے۔ جب ساری کائنات اس جوان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے تو یہ جلیل القدر جوان اپنا سر اللہ کے حضور جھکا دیتا ہے۔

آپ دنیا کی تمام مہذب قوموں کی تاریخ وتہذیب کا مطالعہ فرمالیجیے آپ

دیکھیں گے کہ ہر جگہ جوانوں کا کردار اساسی اور کلیدی رہا ہے۔ قوموں کی تقدیر کو سنوارنے کا سب سے اہم کام انہی نوجوانوں کے دستِ ہنر سے ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے عظیم تخلیق کاروں نے ہمیشہ نوجوانوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ انہیں علم ہے کہ کسی معاشرے میں انقلاب یا بڑی تبدیلی صرف اور صرف جوانوں کی مرہونِ منت ہے۔ ہمارے قومی شاعر اقبال نے بھی جوانوں ہی کو اپنی بصیرت و بصارت کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

عصرِ حاضر میں نوجوان طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی صورتِ حال نے نوجوانوں کو ایک کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں سے ان کے سامنے مستقبل کے تمام راستے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاست روزانہ اپنا چولا بدل رہی ہے۔ معاشرتی بے راہ روی نے سب کو پریشان حال کر دیا ہے۔ معاشی بحرانوں نے زندگی اجیرن کر دی ہے اور مذہبی انتہا پسندی نے دہشت پسندی کا روپ دھار لیا ہے۔ پورا معاشرہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدریں زوال آمادہ ہو گئی ہیں۔ اس بدترین صورتِ حال میں بھی صرف اور صرف نوجوان ہی اُمید کی آخری کرن ہیں۔ اب نوجوانوں پر فرض عاید ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک و قوم کی تقدیر سنوارنے کے لیے میدانِ عمل میں نکل آئیں اور اپنے شباب کو ملک و ملت کی امانت سمجھیں۔

ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر

یہ امر انتہائی خوش گوار ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک باصلاحیت اور ہُنر مند نوجوان **محمد آصف وٹو** ہمارے معاشرے میں موجود ہے جو دنیاوی شہرت اور مادی دولت سے بے نیاز علم وادب کی آبیاری میں مصروف ہے۔ محمد آصف وٹو ۷ا رجون ۱۹۸۱ء کو منڈی احمد آباد ضلع اوکاڑہ میں ایک صوفی منش اور پاک باطن منگے خان کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اوکاڑہ سے حاصل کی اور ایف سی کالج لاہور سے ایم۔ اے اردو کیا۔ ایجوکیشن یونیورسٹی سے ''اردو شاعری میں درد وغم کی روایت'' کے موضوع پر گراں قدر مقالہ لکھ کر ایم۔ فل کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل پیک سلوشن کالج لاہور میں صدر شعبۂ اردو اور ڈین آف آرٹس کے عہدے پر مامور ہیں اور ڈاکٹریٹ کے مراحل کو بحسن وخوبی مکمل کر رہے ہیں۔ ان کی شخصیت سازی میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر ریاض قدیر، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر حسن رضوی مرحوم، پروفیسر عباس تابش، ڈاکٹر نواز حسن زیدی، ڈاکٹر عباس رضا، پروفیسر سلیم اللہ شاہ، پروفیسر عظیم اقبال، پروفیسر عطا محمد بھٹی، پروفیسر منور بخاری اور پروفیسر نور محمد اختر جیسے جلیل القدر اور بے مثال اساتذہ کا کردار اساسی رہا ہے۔ سماجی خدمات میں وہ معروف سیاستدان منظور حسین وٹو کو اپنا رہبر اور ندر فرید وٹو کو رہنما سمجھتے ہیں۔ وہ مخلوق خدا کی خدمت کو اپنا فرض گردانتے ہیں اور جمہور کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ عوام الناس میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کنکر پتھر کو ہیرا بنانے والی چیز صرف اور صرف محنت ہے اور محمد آصف وٹو قیصر بارہوی کے اس شعر کی عملی تصویر ہیں۔

ہیرے میں قیامت کی چمک دیکھنے والو
یہ زہر کے آنسو ہیں جو پتھر نے پیے ہیں

محمد آصف وٹو کو علم وادب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ زمانہ طالب

علمی ہی سے شعر و ادب سے ناتا جوڑ چکے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج اوکاڑہ کے رسالے ''اساس'' کے مدیر تھے اور لاہور میں روزنامہ ''جناح'' اور روزنامہ ''شیشہ'' کے ادبی صفحوں کے انچارج بھی رہے ہیں۔ روزنامہ 'اساس' لاہور اور روزنامہ 'مساوات' لاہور میں ان کے کالم تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ملک کے معروف علمی و ادبی جرائد اور رسائل میں ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات شائع ہو کر صاحبان فہم و فراست سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آصف وٹو کو شاعری سے بھی شغف ہے۔ ان کی غزلیں، نظمیں، سلام اور نعتیں موقر اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''بجھتی آنکھوں کے دیپ'' اور افسانوں کا مجموعہ ''جلتی آنکھیں بجھتے خواب'' اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔

محمد آصف وٹو کا قابلِ قدر اور قابل فخر کارنامہ ان کی تخلیقی اور تنقیدی کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' ہے۔ اس کتاب کو موصوف نے درج ذیل ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

ا) ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف اور اعترافات

ب) ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر

ج) ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی زاویے

د) اردو تنقید میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا اختصاص

اس کتاب میں موصوف نے راقم الحروف کی شخصیت اور فن خصوصاً تنقید کے حوالے سے بعض اہم نکات اُجاگر کیے ہیں۔ ان کا اسلوب استدلالی اور مواد قابلِ توجہ ہے۔ اسی باعث معروف نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کو روشنی مثال قرار دیا ہے۔ ملک کے معروف ناقدین ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سہیل احمد خان مرحوم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر اختر ہاشمی، ڈاکٹر عباس رضا، ڈاکٹر نواز حسن زیدی، پروفیسر سجاد جعفری اور پروفیسر انیقہ سلیم وغیرہ نے اس کتاب کو جدید تنقید میں تازہ ہوا کا

جھونکا قرار دیا ہے۔

محمد آصف وٹو کی شخصیت اور ان کے فنی پہلوؤں کے مکمل احاطے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ وہ ''حرکت و عمل کا استعارہ'' ہیں۔ ان کا طرزِ حیات نوجوانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایسے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ علم و ادب سے ربط رکھنے والے یہ چند شیدائی بھی ہمت نہ ہار بیٹھیں۔

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس خطۂ ارضی میں جوان ہی اللہ کی بہترین مخلوق ہیں لہٰذا عصرِ حاضر کے جوانوں کو چاہیے کہ وہ امانت، دیانت اور صداقت کا تاج اپنے سر پہ سجا کر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا فریضہ ادا کریں۔ جوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر جرأتِ رندانہ پیدا کریں تاکہ وہ معاشرے کی غیر اخلاقی قدروں کی بیخ کنی کر سکیں۔ نوجوانوں کو اپنے آپ کو شرافت، محبت اور بھائی چارے کے اسلحہ سے لیس کر لینا چاہیے تاکہ وہ معاشرے کی منفی قوتوں کو ختم کر سکیں۔ نوجوانوں کو بین الاقوامی صورتِ حال پر گہری نگاہ رکھنی چاہیے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کو اپنی فکر میں جگہ دینی چاہیے۔ انھیں جدید ٹیکنالوجی سے استفادے کی نئی نئی صورتیں نکالنا چاہئیں اور خود کو ایک ایسے ماڈل کے روپ میں پیش کرنا چاہیے کہ دنیا ان کی جانب رشک کی نگاہ سے دیکھے۔ انھیں خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر نہ صرف اپنے وطن بلکہ اقوامِ عالم کی ترقی و بہبود کے لیے کام کرنا چاہیے۔ آیئے جوانوں کو پیروں کا استاد بناتے ہوئے ہم عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو تلقین کریں کہ۔

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

مطبوعہ

(روزنامہ 'دن' لاہور......۲ جون ۲۰۰۹ء)

◆◆◆

ادبی چوپال

کالم

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ادبی چوپال

(ادبی کالم)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اردو ادب کی ایک منفرد ادبی شخصیت ہے۔ وہ نہایت مستعد اور نہایت متحرک انسان ہے۔ وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ اپنے علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ذوق وشوق سے لکھنا، مرتب کرنا اور چھپوانا اس کے ادبی مشاغل میں شامل ہے۔ وہ بیک وقت ادیب بھی ہے اور ادبی کالم نگار بھی۔ نقاد بھی ہے اور محقق بھی اور اس کے ساتھ ساتھ ادارہ سازی کا ماہر بھی ہے مگر بنیادی طور پر وہ ایک نام ور استاد بھی ہے۔ اس کے شاگرد اس کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اس کے احباب اس کے لیے تحسین کے کلمات بلند کرتے ہیں۔ ایک ذات میں اتنے سارے اوصاف کا اجتماع بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شبیہ الحسن ایک ادبی جن ہے اس لیے وہ جو کچھ چاہے آسانی سے کر سکتا ہے۔ وہ اس دور میں مرثیہ کا بہت اہم محقق ہے جس نے اس میدان میں بہت قابل قدر کام کیا ہے اور اب اس کے تازہ ادبی کالموں کا دوسرا مجموعہ ادبی چوپال کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف ادیبوں پر لکھے گئے اس کے کالم اس کی ادبی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

۱۱ جون ۲۰۰۹ء

85-V فیز II ڈی ایچ اے

لاہور کینٹ۔